

PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222902

UNIVERSAL
LIBRARY

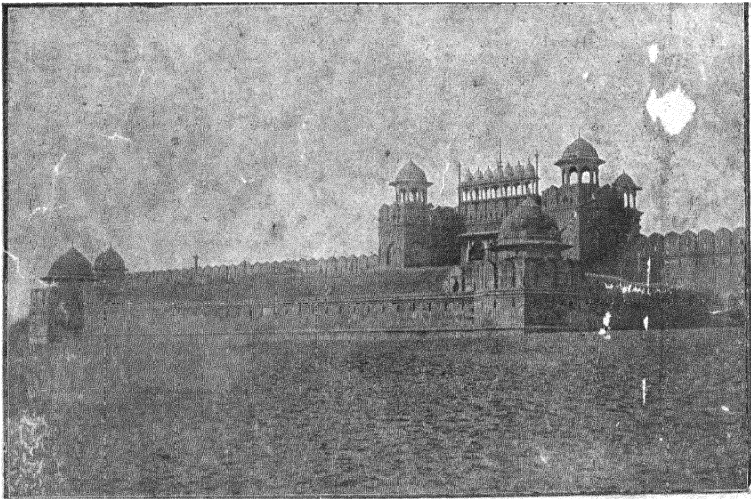
جلد سوم

بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء

حصہ دوازدہم

کتب خانہ
پریس بائوٹھ ہائینہ

اردو



انجمن ترقی اردو

کا

ستھ ماہی رسالہ

۵۵ ف

۱۹۱۵ ۴۳۰۵

۱۹۱۵ ۴۳۰۵

۱۹۱۵

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون نگار	مضمون
۲۶۳	{ جناب نذیر محمد حسینی و پروفیسر ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب ایم اے بی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لا - - - - - }	تتمید شعر العجم
۵۱۳	مترجمہ جناب اب سعید جنگ بہادر ناظم تعلیمات، حیدر آباد (دکن)	خلیات دتاسی
۵۲۷	جناب محمد عظیم اللہ خاں صاحب بی اے - - - - -	شاعری
۵۶۲	نتیجہ فکر جناب ہاشمی صاحب - - - - -	میلاد نبوی صہم
۵۶۳	جناب لانا محمد عیسیٰ الرحمن خاں صاحب شجرہ وانی الخاطبہ نوابہ صدر یار جنگ بہادر	مقدمہ دیوان مدحہ
۵۷۹	نتیجہ فکر جناب محمد عظیم اللہ خاں صاحب بی اے - - - - -	مرے حسن کے لئے کیوں فرسے
۵۸۱	{ جناب ڈاکٹر عبدالسار صدیقی صاحب ایم اے بی ایچ ڈی سپرینٹنڈنٹ کالج حیدر آباد (دکن) - - - - - }	اردو رسم خط میں اصلاح
۵۹۳	جناب تاج الدین حیدر صاحب تاج، بیرسٹر لا بھوپال	کلام و تاج
۵۹۷	جناب شید الطاف حسین صاحب کاظم - - - - -	اصلاح اردو
۶۰۳	ادیسٹر و ڈاکٹر عبدالسار صاحب صدیقی - - - - -	تبصرے
۶۲۱	ادیسٹر - - - - -	انجمن ترقی اردو کا ذکر

تنقید شعر العجم

از

جانب فظ محمود صاحب شیرانی

و

پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر لاہور

پہچان اور

قوالہ اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ لب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور فوجی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا، تاہم دفتری زبان اس کے عہد میں بھی عربی رہی۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتری زبان فارسی کر دی جائے۔ (رض شعر العجم)

سلطان محمود کے دور میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتری زبان فارسی تھی، کیونکہ سلطان کے وزیر اول ابو العباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا، اس لئے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں۔ شمس الدین ابو القاسم احمد بن حسن ممیندی وزیر ہوئے چونکہ وہ عربی داں تھے، اس لئے فارسی ترک کر دی گئی

اور عربی کا رواج ہوا۔ تاہم فارسی کا استعمال قطعاً مشرک نہیں ہوا۔ اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی ذال ہوتا تمام تحریرات فارسی ہی میں بھیجی جاتی تھیں۔

گزشتہ بالا بیان میں نے تاریخ یمنی سے نقل کیا ہے، لیکن تاریخ ہیبتی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مسعود کے زمانے میں، دربار غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی، میرا مطلب یہ ہے کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا۔ جب خلیفہ قاو رب اللہ وفات پاتا ہے، اور قائم با مرشد اس کا جانشین ہوتا ہے، بارگاہ خلافت سے ایک سیفر مع فرمان خلیفہ آتا ہے، یہ فرمان عربی میں تھا، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سنایا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ غزنہ میں عربی کم سمجھی جاتی تھی۔ ہیبتی کے الفاظ یہ ہیں:

”امیر خواجہ بولنصر آواز داد، پیش تخت شد، و نامہ بشد، و باز پس آمد، و روئے فرا

بایستاد، و خریطہ بکشاد، و نامہ بخواند، چوں بیایاں آمد، امیر گفت، ترجمہ اش بخوان، تاہنگنا

را مقرر گرد، و بخواند بیارسی، چنان کہ اقرار دادند شنوندگان کہ کسے را این کفایت نیست“ (ص ۳۹۲)

اسی طرح سلطان مسعود اپنے بیعت نامہ کی جب دربار عام میں تصدیق کرتا ہے تو ابونصر مشکافی اصل عربی

کو پڑھ کر سناتا ہے لیکن اس کے فارسی ترجمہ کو خود سلطان مسعود پڑھ کر حاضرین کو سناتا ہے چنانچہ:-

”امیر گفت، شنودم و جملہ آں مرا مقرر گشت، نسخہ پارسی مرادہ، بولنصر بد و باز داد و

امیر مسعود خواندن گرفت و از بادشاہان این خاندان رضی اللہ عنہم ندیم کسے کہ پارسی چنان

خواندے و بنشتے کہ وہ نسخہ عہد رانا آخر بر زبان راند، چنان کہ یہی قطع نہ کرد، و پس

دوات خاصہ پیش آوردند، و وزیر آں بخط خویش تازی و پارسی ہم زیر آنچه از بغداد

آوردہ بودند و ہم زیر آنچه استاد م ترجمہ کردہ بود بنشتے،“

بیعت نامہ کا اصلی عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے طیار ہو کر آتا ہے، لیکن سلطان مسعود عہد بیعت

کرتے وقت اس کے فارسی ترجمہ کو ترجیح دیتا ہے، چنانچہ فارسی عہد نامہ کو سب دربار پڑھ کر سناتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ دربار غزنہ میں فارسی ہی درباری زبان مانی جاتی تھی، علاوہ ازیں ہیبتی میں اور

میسوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، لیکن یہ سب فارسی میں ہیں، جس سے بوٹوق کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی۔

قولہ ”سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں اُن اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ، عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارہ سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے مغزی اس وقت تک دربار میں آمیدواری کرتا تھا، موقع پا کر اس نے برجستہ کہا:

لے ماہ چو ابروانِ یارے گوئی یا ہجو کمان شہر یارے گوئی
نعلے زدہ از زر عیارے گوئی در گوش سپر گوشوارے گوئی
یعنی لے چاند تو ابروئے معشوق ہے یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسب خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کئے، مغزی نے پھر برجستہ کہا:
چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من شنید چوں باد یکے مرکب خاتم کشید
سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ سنجر کا لقب مغز الدین بھی تھا، اُس لے مغزی لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہے، ”شوالیم (صد ۱۰۰۲)“

حکایت بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی ہے بلکہ نظامی عروضی جو اس قصہ کا سب سے قدیم راوی ہے اور جو تمام قصہ خود امیر مغزی کی زبان سے سناتا ہے، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب

کرتا ہے، اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں اور بھی ضمنی اختلافات ہیں۔ ایک موقع پر امیر مغربی نظامی سے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے باپ الشہر بربانی نے ابتداء عہد سلطنت سلطان ملک شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجھ کو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے جس کا ایک بیت یہ ہے۔

من رفتم و فرزند من آخلف الصدق اور انجند او سجد او ند سپردم
سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور چندی میرے نام کر دی گئی اور بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر رہا، لیکن بادشاہ کا دیدار دوسرے بھی مجھ کو میرے نزدیک اور تنخواہ سے ایک دینار تک موصول نہیں ہوا، اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل بن شہزادہ علاء الدولہ امیر علی فرامرزی کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ شہزادہ شعر دوست ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا، دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ یہ بہت مشکل ہے کہ جو وصف باپ میں ہو بیٹے میں بھی ہو بات یہ ہے کہ امیر بربانی میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا، اور سلطان شہید الپ ارسلان فرخ شہر میں اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت کا واقع ہوا ہوں، سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری ہے، تنخواہ سے ایک جہ وصول نہیں ہوا ہے اور مفت میں ہزار دینار کا قرضدار ہو گیا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر سلطان سے اجازت دلوادیں تاکہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نکالوں۔ امیر علی نے جواب میں کہا یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی، لیکن اطمینان رکھ کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، آج مغرب کے وقت بادشاہ جانا دیکھنے نکلے گا، تو حاضر رہنا دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سودینار نیشاپور میں انجھو اسی وقت مل گئے، میں خوش خوش گھر آیا، اور رمضان کے بند و بست میں مصروف ہو گیا، عسر کے قریب سراپردہ سلطانی پر آکر حاضر ہو گیا، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں :

د آفتاب زرد سلطان از سر پرده برد آمد، کمان گروہہ و زد دست علار الدولہ بر رہست
من بدویم و خدمت کردم، امیر علی نیکو سہا پیوست و بہاہ و دین مشغول شدند، و اول کے کہ
ماہ دید سلطان بود، عظیم شادمانہ شد علار الدولہ مرا گفت، پسر ربانی دریں ماہ نو چہرے
بگوئے من بر فور این دو بیتہ بگنتم:

لے ماہ چو ابروان یاری گوئی یانی چو کمان شہریاری گوئی
نعلے زده از زر عیاری گوئی درگوشش سپہر گوشاری گوئی

چوں عرضہ کردم، امیر علی بسیارے تحسین کرد، سلطان گفت برو از آخر ہر کدام اسپ کہ
خواہی بکشائے، و دریں حالت بر کنار آخر بودیم، امیر علی اسپے نامزد کرد، بیاوردند و کمان
من دادند، از زیدے سی صد و نیار نشا پوری، سلطان بمصلتی رفت و من در خدمت،
نماز شام بگزاردیم و بخوان شدیم، برخوان امیر علی گفت پسر ربانی دریں تشریفے کہ
خداوند جہاں فرمود ہیچ گفتنی عالی دو بیتہ بگوئے من بر پائے حتم و خدمت کردم و چنانکہ
آمد حالے این دو بیتہ بگنتم۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من شنید چو باد یکے مرکب خاصم بخشید

چوں این دو بیتہ ادا کردم، علار الدولہ اسفہتا کرد و بسبب احسن او سلطان مرا ہزار و نیار
فرمود علار الدولہ گفت جاگی و اجر کشن رسیدہ است فردا بردا من خواجہ خواہم نشست
تا جاگیش از خزانہ بفرماید و اجر اش بر سپاہاں نویسد، گفت مگر تو کنی کہ دیگران را این
حسبت نیست و اورا لقب من باز خوانید و لقب سلطان مغرالدینا و الدین بود، امیر علی
مرا خواجہ مغزی خواند، سلطان گفت امیر مغزی، آں بزرگ بزرگ زادہ چناں ساخت کہ
دیگر روز نماز پیش ہزار دینار بخشیدہ و ہزار و دو سیست دینار جاگی و برات نیز ہزار
غلہ بمن رسیدہ بود و چوں ماہ رمضان بیرون شد مرا بہ مجلس خواند و با سلطان ندیم کرد

واقبال من روئے در ترقی نہاد و بعد ازاں پیوستہ تیمار من بھی داشت و امروز ہر چہ دارم از عنایت آں بادشاہ زادہ دارم، (چارم مقالہ طبع لیدن ص ۴۳ و ۴۲) قولہ ”غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آؤر نظامی ہی ہیں“ (ص ۱۳۲)

تغزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں کیونکہ غزل کے پہلے باغبان شہید، رودکی اور دققی ہیں۔ غزنوی دور میں عصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف دیکھا جاتا ہے حکیم سنائی زیادہ تر زہدیت اور کمتر تصوف کی مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں، مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے، انوری کے ہاں سوز و گداز اور نعلین محض ہے اور یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کار بستہ بناتے ہیں، رندوں کے آغوش میں پرورش کرتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دو عملی میں اس کا نشیمن آباد کرتے ہیں، مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا کر اسے مست سردی بنا دیتے ہیں، حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لیکن سنائی، انوری اور خاقانی کے مقابلہ میں انھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا، اس لئے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکر یہ کے مستحق نہیں ہیں۔

حکیم سنائی

دیوانہ لائے خوار کے قصہ کے ذکر کے بعد جس کو بسبب کثرت شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں:

”قوالہ“ حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بٹہ کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو

ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا:

من نہ مرد زن زرو جاہم بخدا اگر کنم و گر خواہم
گرتو تا جم دہی ز احسانم بسر تو کہ تاج نستام (شعر المص ۲)

مجھ کو اس قصہ پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے، اس لئے کہ یہ اشعار حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں

اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے چنانچہ اشعار

روزگارم حسود بیابکم از دل شوخ جان غنالم
پسے بر پام آمد ز غم نصبت لاجرم دست میز غم برست (حدیقہ ص ۹۶)

دیگر

عمر و آدم بجلی برباد بر سن آمد ز نصبت صیداد (ص ۹۹)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقعہ پر ان کا ایراد ہوا ہے وہاں متن میں کوئی ایسا ایمار نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجہ بالاقام کرنا خالی از غایت نہیں ہے۔ یہ اشعار ”تقاعد“ کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص پادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے۔ انہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں۔

زاں کہ چوں طوق منت بکشم لقمہ خوانِ نعمت بجشم
نوم بر طبع دشت گوئے ایں نیابی زمن جزا من حجے (حدیقہ ص ۱۱)

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریح نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ شاعر کا اصل

مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہے اور پادشاہی خدمت سے اعراض و اغاض وغیرہ وغیرہ

قولہ ”حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کیا تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں اس لئے علماء نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے، دار الخلافہ بغداد سے استغاثہ طلب کیا، وہاں کے علمائے لکھا کہ یہ مسائل

قبل اعتراض نہیں، (شعاب العجم ص ۳۱)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہے، بہرام شاہ نے دار الخلافہ سے استغفا طلب نہیں کیا ہے خود دولت شاہ جس سے غالباً مولانا نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہتا ہے:

”چوں کتاب حدیقہ تمام کرد، علماء ظاہر غزین بر حکیم طعن کردند و اعتراض کردند و آں کتاب را بدارالاسلام بغداد فرستاد و بدار الخلافہ عرض کرد و از علماء بغداد و ائمہ آں دیار بر صحت عقیدہ خود فتویٰ حاصل کرد،“
مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔

”چوں کتاب حدیقہ را با تمام رسانید، بمطالعہ علماء ظاہر غزین درآمد، زبان طعن بر او دراز کردند و بہ کفر و اسحاق منسوب نمودند، خواستند اورا تشہیر کنند، اول علماء غزین گفت کہ چراما ملامت و سرزنش می کنند، گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتہ، گفت کتاب حدیقہ را علماء دارالاسلام بغداد عرض می دارم، اگر علماء آنجا بر کفر من فتویٰ دهند ہرچہ سزاے ما باشد ہمارا سناید، پس حدیقہ را بدار الخلافہ بغداد فرستاد، و از علماء بغداد و ائمہ آنجا بر صحت عقیدہ خود فتویٰ ساخت، علماء و ائمہ آنجا بر صحت عقیدہ و بہ ثبوت ایمان و مذہبش دستخط و مواہیر نمودند، ازاں سرزنش و ملیہ نجات یافت،“
مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہے، اس بارہ میں حدیقہ کے خاتمہ میں کافی اطلاع موجود ہے۔

سنائی امیر زبان الدین ابوالحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔
اسے تو بردین مصطفیٰ سلاطین بر طریق برادران کن کا عہد دیرینہ را بیا د آور از طریق برادری مگذر
دین حق را بجی توئی برہاں مرمازیں عقیقہا برہاں تو بہ بغداد شاد و ن شاد خود گوی و را رسم فریاد
سال و نہ ترساناں اندگیں گشتہ مجوس تربت غزین (مض و نکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام یا

لکھی تھی، منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں :
 ”و حدیقۃ الحقیقۃ شیخ بنام اوست کہ در ایام حبس فرمودہ وجہ حبس شیخ تعصب
 غزنویہ بودہ وروادی نسن،“ (صل طبع نوکشتور)

مکن آخر برادری پین آر و زمیلان این مجاہد بردا گرچہ ہستم اسیر ہر ناہل چشم دارم کہ کار گرد و سہل
 تاکے این انقباض میں دری بسر من کہ تو نہ معذوری عمد ہائے قدیم را یاد آر حق مان و نمک فرو مغوار
 اس کے بعد حدیقۃ کے ذکر میں کہتے ہیں :

این کتابے کہ گفتہ ام در پند چون رخ حور دہلرو دہند ہر چہ دانستہ ام ز نوع علوم کردہ ام جملہ خلق را معلوم
 آنچہ نصرت و آنچہ اخبارست و ز مشائخ ہر آنچہ آہناست اندرین نامہ ہلکی جمع ست مجلس عقل را یکے شمع ست
 ملکوت این سخن چو بر خوانند حرز و تہوید خوشنیت دہند یک سخن زین و عالمے دانش بچو قرآن پارسی دانش“ ۵۳
 اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں :

”جاہلان جلد ناپسند کنند و ز سر جہل ریشخند کنند دان کہ باشد سخن شناس حکم بچو قرآن ورا کند تغنیم
 مگر کند طعنے اندرین نادان گو کہ نیست بہتر از قرآن بر شاں لفظم اربو و ترفند تو بر و شکر کن برایشاں خند
 نخورم غم گر آل بوسیفاں بنو نذا حدیث من شاواں بندہ را مہج مصطفیٰ ست غذا جان من باو جانیش را بقدا
 آل اورا بجاں خریدارم و ز بدی خواہ آل ہزارم گرد ست این عیثدہ و نذا ہم ہرین بد ہاریم یارب“ ۵۴
 اس کے بعد امیر بریا نگرست استغفا کرتے ہیں :

تو چہ گوئی بیار و فتویٰ کن نیست اندر سخن مجال سخن گفتم این و بہت فرستادم در گنج علوم بکشاد م
 گر ترا این سخن پسند آید جان من رستہ از گزناید و پسند تو ناید این گفتار خود ندیدی بجلہ باد انکار
 این سخن را مطابقت فرمائے نیک و بد و جواب باز نمائے ندیم میں ازین ترا تصدیق عرض کن بر بہ شریف و وضع
 گوئی این اعتقاد مجہد و ست جلد بر گفتش آنچہ مقصودست ۵۵

حکیم سنائی ایک معلم کے فرزند تھے، جیسا کہ حدیقۃ الحقائق کے دیباچہ میں ارشاد کرتے ہیں، حدیقۃ آپنے
 خواجہ رئیس احمد بن مسعود بمبئی کی فوائیش سے لکھا ہے

لیکن کنوں زبس کرش زیر تیشہ ام خواجہ رئیس احمد مسعود جیشہ را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمد ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل تھے، سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی ۱۲۵۵ھ سے ۱۲۸۵ھ تک مصروف رہے۔

پانصد و سبست و چار رفتہ زغام پانصد و سی و پنج گشتہ تمام
بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہے ع

پانصد و سبست و پنج گشتہ تمام

حلیقہ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار الحاقی بھی ہیں، مثلاً جنگ جل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ جنگ جل (۱۳۶ھ) میں حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ایک فریق تھے اور حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ ایک فریق۔

حلیقہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کو ایک فریق قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف پٹ جاتے ہیں۔

در جل چوں معاویہ گر بخت خون ناحق بسے بخیرہ بخت شد نہریت بجانب بغداد گشتہ از فضل زشت خود ناشاد
جب حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کوهیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہوج گرتا ہے، ام المومنین امان مانگتی ہیں
حضرت علیؓ، حضرت محمد بن حضرت ابوبکرؓ کو بلواتے ہیں اور محمدؐ آکر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں، لیکن حضرت علیؓ منع کرتے ہیں۔

بل آں ستیزہ را پے کرد برگ و ساز معاویہ نے کرد ہوج زن بنجاک تیرہ فنا و زخماں نقاب رخ نکشاد
منت بدر کردہ ام امامم وہ و زرحم کنوں زانم وہ چوں بدیند زود برگشتند درخوی و خون و راین غشتند
اندجیدر برادرش رازود جملہ احوالسا و را بنود رفت وقتے محمدؐ بو بکر آں ہمہ صدق و فارغ از ہمہ بکر
و برآہنیت تیغ تا بزند گفت حیدر مکن کس اینکند عفو کن تا بسوئے خانہ رود بعد ازین کار ہائے بد نمخذ

(ص ۲۸۵)

حضرت محمدؐ پھر اپنی بہن کو مکہ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں آپ جب مکہ پہنچ جاتی ہیں، کچھ عرصہ بعد حضرت معاویہؓ

آپ کو قتل کر دیتے ہیں ۛ

برگرفتہ محمد از سرِ راہ جہالتِ شکر شدہ زکارِ آگاہ لبوسے مکہ زود بفرستاد در تواضع محلِ رونہاد
 باہزاراں خجالت و تشویر رفت زی مکہ جفت گرم و جیر عاقبت ہم بدست آن باغی شد شہید و کشت آن طاعنی
 آن کہ با جنت مصطفیٰ زیساں بیکند مرد را بمسرد و محول (ص ۲۸۱)

شاعری کی ایک اور اہم خدمت، جو سنائی نے کی ہے، تغزل ہے۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کر لی ہے۔ بلحاظ زبان ان کی غزل، قطعہ، اور قصیدہ میں، متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا ہے۔ تخلص کا رواج، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انہی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ وارداتِ حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انہی سے شروع ہوتا ہے، اگرچہ مذاق میں زہدیت غالب ہے تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بنانے والے حکیم سنائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے انہی کے کلام میں ملتے ہیں۔ عطار اور مولانا روم انہی کی بنیادوں پر قصروایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سنائی کے ہاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کرٹھ لیتی ہے۔ زہد خٹک کا خاتمہ ہوتا ہے اور رندی اور سستی کی داغ بیل ڈال دی جاتی ہے، صومہ چھوڑا جاتا ہے۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہے۔ زاہر ہی سے اعزال ہوتا ہے، اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ امثال

دردِ دل آں را کہ روشنائی نیست در خراباتِ استنائی نیست
 پسرا خیز و جام بادہ بسیار کہ مرا برگِ پارسائی نیست
 جرعہ سے بجان و دل بخرم پیش کس سے بدیں والی نیست

دیگر

اے ساتی، مے پیار پیوست کاں یار غریز تو بہ لبشکت
 برخاست ز جہانے زہد و دعویٰ در میکدہ بانگزار بہ نشست
 بنہاد ز سرِ ریاد طامات از صومعہ ناگماں برو جست
 بنہاد ز پائے، بند تکلیف زنا ر مغانہ بر میاں لبست

سے خورد و فرا بگفت، سے خور تا بتوانی مباش خرمست

اندر رفتی ہی رو آتش در زن نرچہ وے بہت

میرزا محمد حواشی چار مقالہ (۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات باصح اتوال شمسہ میں ہوئی ہے۔

امیر معزی المتونی ۲۲ھ کے مرثیہ میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں:

تا چند مغرای معزی کہ خدائیش زیں جالفک برد و بای ملکی داد

چوں تیر فلک بود فزیش سرہ آورد بیکان ملک برد و بہ تیر فسلکی داد

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان بنجر کی بھی مداحی کی ہے، ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے ۵

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است در دہ آں آتش کہ آپ زندگانی آمدہ است

سنو کے ابتدائی تحت نشینی کے ایام میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں ۵

چوں بسلطانی نشستی تنیت گویم ترا اے کہ اسلاف ترا سلطان نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارف زرگر اور قاضی فضل بن بھجی بن صاعد اور علی بن مصیم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کئے ہیں۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابو المفاخر، محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تالیف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں اور بقول پروفیسر محمد اقبال ام اے۔ پی ایچ ڈی منوی سیر العباد الی المعاد بھی انھی محمد بن منصور کے نام لکھی ہے۔ (حواشی راحت الصدور ص ۱۷ طبع پوربند)

عمر خیام

از

پروفیسر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی

پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی علوم و فنون کی سرپرستی کے لئے جو صحیح راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے

کہ عربی، فارسی، اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے یورپی ڈگریوں والے اصحاب کو یونیورسٹی

پروفیسر مقرر کیا ہے۔ ان اصحاب میں عربی کا صیغہ پروفیسر محمد شفیع ام اے کی ذات گرامی

سے مشرف ہے اور فارسی صیغہ پروفیسر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی سے متعلق رکھتا ہے۔

پروفیسر اقبال گزشتہ سال کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں سلجوقیوں کی سب سے قدیم تاریخ المسلمین بہ راحت الصدقہ وآیۃ السورۃ تالیف محمد بن علی بن سلیمان الراوندی کو جو ۵۹۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے، نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ شائع کیا ہے اور علمی تحقیقات و تلاش کی پوری پوری داد دی ہے۔

میری درخواست پر آپ نے عمر خیام کے متعلق، مولانا شبلی کے تصنیف پر یہ چند انتقادی خیالات ظاہر کئے ہیں۔

محمود شبیرانی

اسلامی دنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیام کی ہستی بالکل نیکلی ہے۔ ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت، اس کے ذاتی حالات، اس کے مذہبی اخلاقی اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب خانہ بن سکتا ہے۔

لیکن یہ جو کچھ اب تک ہوا ہے سب اہل مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ مسلمان بلکہ خود اہل ایران جن کے لئے خیام کے کمالات مایہ ناز ہو سکتے تھے شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا، اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ جس پر زرا سا بھی اعتبار کیا جاسکے محفوظ نہیں رکھا گیا اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہے اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کر چکا ہے، ہماری بے توقبی بدستور چلی جا رہی ہے۔ ہر چند یہ ہمارے لئے شرم کی بات ہے کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں لیکن اس

بھی بڑھکر شرمناک امر یہ ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اٹھائیں۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھانا اور اپنے پیشرو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا ان کے ذخیرہ امکانات میں اضافہ کرنا ہر صاحب تصنیف کا فرض ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس درجہ قابل الزام نہیں جتنا کہ یہ امر قابل اعتراض ہے کہ ان معلومات کو جو پہلے سے مہیا کی جا چکی ہوں نظر انداز کیا جائے۔

یہی وہ اعتراض ہے جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب شعرالبحم میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اردو ادیبوں میں واحد شخص ہیں جنہوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً بحم کی شاعری پر ناقداً نظر ڈالی ہے۔ ان کے فضل و کمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحب کمال کے بارے میں جس کی شخصیت کے متعلق علمی دنیا اس قدر گہری دل چسپی کا اظہار کر رہی ہے، ہماری معلومات میں اضافہ کرینگے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے ان شکوک کو رفع کرینگے اور ان غلط روایتوں کی تردید کرینگے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن شعرالبحم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ جو تفصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صالح نظام الملک وزیر اور خیام تینوں ایک ہی کتب میں ہم سبق تھے اور انہوں نے زمانہ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پا کر کسی بڑے منصب پر پہنچے وہ اپنے ساتھیوں کی وسنگیری کرے۔ مولانا نے محض ایک مقبول عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ مورد شکوک ہے کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیے۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرہ کی متعدد کتابوں میں منقول ہے مثلاً تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر اور تذکرہ دولت شاہ سمرقندی وغیرہ میں۔ لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحب جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہے۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہے تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ہم اس کو محض ایک

مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کر لیں۔ اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلاء نے جو فارسی زبان کے ماہرین تھے، ان کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن سب سے زیادہ قابل وقت وہ تھے جو چار مقالہ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتاب مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہے۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہل زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی رائے اس بارے میں ہر طرح قابل اعتماد ہے۔ ہم ان کی عبارت کا مختص یہاں درج کرتے ہیں:-

”رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ نے جو کہ ۷۸۷ھ میں مقتول ہوا اپنی کتاب میں عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عمد و فائدہ باندھنے کی حکایت بیان کی ہے۔ یہ حکایت رشید الدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب ”سرگزشت سیدنا“ سے اخذ کی ہے جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعہ الموت کے کتاب خانے میں تھی۔ ہلاکوناں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاء الدین عطا الملک جوینی صاحب تاریخ جہانگشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جا کر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے، اس کے باقی کو جلا دے من جملہ ان کتابوں کے جو علاء الدین نے محفوظ کر لیں یہ کتاب بھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود علاء الدین نے جس نے کہ اپنی کتاب تاریخ جہانگشا کا ایک مستقل حصہ اسماعیلیوں اور قلعہ الموت کی تاریخ میں لکھا ہے۔ اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ دوستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہے۔ نظام الملک کی تاریخ ولادت باتفاق مورخین ۷۸۷ھ ہے اور تاریخ وفات ۸۰۷ھ، عمر خیام اور حسن صباح کی پیدائش تو معلوم نہیں لیکن ان کی وفات کی تاریخ ۸۰۷ھ اور ۸۰۸ھ ہے۔ پس اگر خیام اور حسن نظام الملک کے ہم سن یا متقارب السن تھے جیسا کہ اس حکایت کا مقصد ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں کی مدت عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی اور گویہ عادۃً محال نہیں تاہم مستبعد ضرور ہے۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑی ہوئی ہو تو چنداں بعید الوقوع بات نہ تھی تعجب اس بات پر ہے کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر فوق العادہ عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریح یا اشارہ

ان دونوں اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا^۱

نظامی عروضی مصنف چار مقالہ جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہے۔ خیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۵۸۵ھ میں بادشاہ وقت نے خیام کو پیغام بھیجا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو کہ جو برف باری سے محفوظ ہو۔ چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کر دی۔ سردی کا موسم تھا ابھی ٹھوڑی دور نکلے ہوئے کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور سرد ہوا پٹنے لگی۔ خیام ساتھ تھا بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اس نے کہا کہ آپ زرا صبر کریں۔ ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہے اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہے۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مابین تو ۵۸۵ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیے۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ ایک سو برس کے بڑھے پھوس کے لئے اعمال نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرنا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمارا ہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرن قیاس ہے ؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم کبتوں سے عمر میں بڑا تھا تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہوگی۔ اگر خیام اور حسن صبح نے اسی اسی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی تو ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۵۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے قریباً ساٹھ برس بڑا ٹھہرا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو جب کہ دوسری طرف ہم کو معلوم ہے کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابوعلی شاذان گورنر بلخ کے ہاں بحیثیت کاتب کے ملازمت اختیار کر لی تھی۔

۱ چار مقالہ طبع یورپ صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷

۲ دیکھو کتاب مذکور جلد ۱ صفحہ ۲۳۰

۳ دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ نظام الملک

اگرچہ یورپ میں کتاب چار مقالہ شعر العجم کے بعد شائع ہوئی لیکن اوپر کی عبارت میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر پروفیسر برٹون نے اپنی کتاب ”تاریخ ادبیات ایران“ کی دوسری جلد (صفحہ ۱۹۲۹) میں درج کئے ہیں اور پھر قریب قریب انھیں مطالب کوون فیلڈ صاحب نے دیباچہ رباعیات عمر خیام (طبع لندن ۱۹۰۷ء) میں تحریر کیا ہے۔ رباعیات کے اس ایڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا اگر انگریزی سے ناابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہولسمانے عماد الدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ زبدۃ النصرۃ (طبع لندن ۱۸۸۹ء) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں دہرائی ہیں اور ساتھ ہی ایک دل چسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابل تسلیم ہے۔ وہ یہ کہ دراصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم کتب نظام الملک نہ تھا بلکہ انوشیروان بن خالد تھا جو کہ منصب وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا۔ چنانچہ خود انوشیروان نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے۔

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیروان بن خالد کے حالات زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کئے گئے ہیں۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لئے اس قدر مواد جمع کیا جاسکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسائل کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی (۲) نزہۃ الارواح شہر زوری۔ جس کو وہ تاریخ احکما شہر زور کے نام سے یاد کرتے ہیں (۳) تاریخ الکامل لابن الاثیر (۴) تاریخ احکما تفضلی (۵) چار مقالہ نظامی عوضہ

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کئے جاسکتے تھے وہ بے شک انھوں نے اخذ کئے ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر کیا گیا ہے جس کو اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہے۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہے کہ ایران کے جتنے نامور شاعر گزرے ہیں مثلاً فردوسی، انوری، حافظ، عطار، خیام وغیرہ۔ ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں اور جتنی کسی کی شہرت زیادہ ہے اتنا ہی اس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہے حتیٰ کہ حافظ اور فردوسی جیسے مایہ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی گئی، ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب ہوں تو ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں سے ہاتھ لگ جائیں ترک کر دینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت بڑے ادبی نقصان کا موجب ہو سکتا ہے مولانا شبلی نے خیام کے ذخیرہ حالات میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیا مل سکتا تھا نصیب کے قریب بالکل چھوڑ دیا ہے جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہے۔ خیام کے متعلق پروفیسر نزو کوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون جو انھوں نے ۱۸۹۹ء میں روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں اکرٹر اس نے ۱۸۹۹ء میں رائل ایشیائیک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا اس کا علم مولانا کو ضرور تھا کیونکہ انھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکے کہ اس کو منگو کر ایک نظر دیکھ لیتے ورنہ اتنی بڑی فروگزاشت ان سے سبزد نہ ہوتی۔ اس مضمون میں پروفیسر نزو کوفسکی نے ان تمام کتابوں کو جن میں خیام کے حالات تھوڑے بہت مل سکتے تھے باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر ذکر کیا ہے اور جو حالات ہر ایک کتاب میں ہر آئے ہیں ان کو بھی جمع کیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہو گا کہ علاوہ ان پانچ ماخذوں کے جن کا استعمال مولانا نے کیا ہے اور جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابلِ وقعت نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو 'مرصاد العباد' تالیف شیخ محمد الدین ابو بکر رازی معروف بہ "دایہ" ہے جو ۱۲۳۸ھ میں لکھی گئی۔ دوسرے 'انکار البلاد' قزوینی، جو ۱۲۳۸ھ کی تصنیف ہے۔ تیسرے 'جامع التواریخ' ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ چوتھے فردوس التواریخ

مصنفہ مولانا خسرو ابرقوی جو ششہ میں لکھی گئی ہے اور پانچویں تاریخ الفی جو اکر کے عمد کی مشہور تصنیف ہے۔

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کئے گئے ہیں ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دہرانا نہیں چاہتے جس کو اشتیاق ہودہ پروفیسر تروکوفسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ یا کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر بلحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہے اور اس کی شاعر کے محاسن دکھائے ہیں لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگزاشت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ رباعیات کا کوئی صحیح نسخہ جو قابل اعتماد ہو سکے ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ پہلی نسخے جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترک رباعیوں کی ایک قابل اعتبار تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہے اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

خیام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو جو اعتماد کے قابل ہو۔ زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اول تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم، عطار، حافظ، سنائی، انوری، بوعلی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور سب کے مضامین متحد اور مشابہ ہیں لہذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا تپا لگانا محال ہے۔ پروفیسر تروکوفسکی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہے کہ یہ رباعیاں دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نیز ان شاعروں کی فہرست دی ہے جن کی تعداد چالیس سے زائد ہے اور اسی فہرست کو پروفیسر برٹون نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر گلن ماہر فارسی، رباعیات ختم

(طبع لندن ۱۹۰۹ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژو کوفسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک (یعنی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۹ء تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کر کے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہے اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حالات موجودہ میں خیام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہے۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور ان امور پر بالکل کوئی بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو ممکن طور سے خیام کی اپنی کہی جاسکتی ہیں۔ اس کی رباعیوں کی شناخت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو کیوں کر، کون سا مبطوعہ یا غیر مبطوعہ نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مذاق سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہو سکتا ہے۔ خیام کی رباعیات کا دوسروں کے رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا وغیرہ۔ اس بحث کو حسب ضرورت طول دیا جاسکتا ہے اور رباعیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے حد سے زیادہ دل چسپ ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ ان کے لئے بے حد ضروری ہے کیوں کہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں متعین نہ ہو سکیں گی اس کی شخصیت شکوک اور قیاسات کے غبار میں مدفون رہے گی۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کون سا نسخہ ان کے پیش نظر ہے جس میں سے وہ تنقید کے لئے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ساری دنیا میں فقط ایک ہی نسخہ جس کا متن متحد ہے دستیاب ہو سکتا ہے جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں لہذا پتہ نشان بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لئے انتخاب کی ہیں ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژو کوفسکی کی ان بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو انھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے ان میں سے ہر ایک کا پلا مصرع ناظرین کی دل چسپی کے لئے لکھ دیا جاتا ہے :-

سلیح افسوس ہے کہ ژو کوفسکی کا اصلی مضمون جو انھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا دستیاب نہیں ہو سکتا ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہے مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں شعر کا نام نہیں دیا۔

- (۱) من بعدہ صم ضاعے تو کجاست
 (۲) آغم کہ پدید گشتم از قدرت تو
 (۳) اے چرخ زگردش تو خرسندیم
 (۴) گویند کہ فردوس بریں خواہد بود
 (۵) جمعے متفکرند در مذہب و دین
 (۶) گراز پے شہوت دہو خواہی رفت
 (۷) ایزد چو نخواست آنچه من خواستہ ام
 (۸) درباب کہ از روح جدا خواہی رفت
 (۹) در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
 (۱۰) با این دوسہ ناداں کہ چنان می دانشد

خیام کی تصنیفات کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

”تصنیفات بہت کم ہیں۔ نیچے جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے“ (شعر البعم صفحہ ۲۳۰)

خیام کی کوئی نیزچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی۔ رباعیات کے علاوہ جو کتاب یورپ نے شائع کی ہے وہ دراصل اُس کا الجبر ہے جس کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے بمقام پیرس ۱۸۵۱ء میں چھاپا گیا ہے یہ الجبرا اور اس کے ساتھ تین تصنیفیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا اور لطف یہ ہے کہ ان تین میں سے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں۔ ایک کا نام ”رسالۃ فی شرح ما اشکل من مصائد اقلیدس“ جس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں ہے۔ دوسرے ”رسالۃ فی الاعتبال لمعرفۃ مقدار ری الذہب والفضۃ فی جسم مرکب منہما“ جس کا نسخہ مقام گوٹھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہے اور تیسرے ”لوازم الامکنۃ در فصول و علت اختلاف ہوامی بلاد و اقلیم“ ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہے :-

”... خیام مسائل فلسفہ کے بیان کرنے میں نہایت نخل کرتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر

ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفاس میں تفصیل لکھ چکا ہوں“ (صفحہ ۲۲۹-۲۳۰)
 کتاب عرائس النفاس جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتایا ہے اس کے لئے انھوں نے کوئی سند نہیں دی

شہر زوری کی اصل عبارت میں جس کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اور جو بعینہ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۳) میں نقل کی گئی ہے غائب النفس کا کہیں ذکر نہیں، ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھادی ہے۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کئے گئے ہیں ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی فارسی زبان کے جاننے والے جو بواسطہ انگریزی تاویج ایران کا مطالعہ کرتے ہیں، ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔ البتہ اردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا۔ جب کہ شعر الجم صبی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہے تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں بعید از قیاس ہے۔

اقبال

اوصالدین انوری

قولہ ”محمد نام“ اوصالدین لقب، انوری تخلص امیورود کے علاقے میں بدھمنہ ایک گاؤں ہے،

جو ممتہ کے مقابل واقع ہے، انوری ہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عربی

کتاب ہے (ع) انوری گربود از ممتہ منم از شیراز “ (شعر الجم ۲۶۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بعد ممتہ جلد اس کا کلام جمع کیا ہے اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے اس کا نام علی بتاتا ہے۔ صاحب دیباچہ کے الفاظ ہیں۔

”امیر حکیم امام ہمام اوصالدین عماد الاسلام نادرۃ الفلک اعجوبۃ الزمان انضج فصحاء الدہر

ملک الکلام والشعر علی الانوری نور اللہ مرقدہ و متواہ و عرف بفضلہ ثراہ “

البتہ محمد اس کے باپ کا نام تھا اس پر محمد عوفی اور شادی آباد سی متفق ہیں۔ دادا کا نام اسٹی تھا

عہ شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی بصفت شادی آباد عن ماڈو کا رہنے والا ہے اور سلطان ناصر الدین
الوی مشہور و ملاحظہ کی فرمائش پر اس نے یہ شرح لکھی ہے۔

انوری کے کلیات سے ثابت ہے شعر

زندہ اسلاف تو توجو بمن قدم اسحق و حبت اسمعیل سے
وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے انوری خود ایک سے زیادہ
مقام پر اپنے آپ کو خاوران کی طرف منسوب کرتا ہے۔ قطعہ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر سپہر صیت پیدا شد ز خاکِ خاوران تا شبانگاہ ابد چار آفتابِ خادری
خواجہ چوں بوطی شیدائی آن صاحبِ قبال مفتی چوں اسعد شجاعان ہر شرکے بری
صوفی صافی چو سلطانِ طریقت بوسعید شاعرے ساحر چو مشہور خراساں انوری
وے ز خاکِ خاوران چوں رہ مجبول آمدہ گشتہ امروز اندر و چوں آفتابِ خادری سے
چندل کہ از زبانت بر آید گیر ز در خاوران نیم کہ میسر نمی شود سے
کاندرا طرافِ خاوران از وے ہر کس را ہی نیاید سے

خاوران ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مشہ، نساء، ایورد اور درگز شامل ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ
خاوران ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبہ کا نام بھی ہے اور انوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے
قولہ ”انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیر یاد کیا اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا
مطلع یہ ہے :-

گردلِ دستِ بحر و کاں باشد دل و دستِ خدا یگاں باشد
صبح کو در بایں جاکر قصیدہ پڑھا، سحر نہایت سخن شناس تھا بہت مخطوط ہوا اور کہا

عہ کلیات انوری، طبع نول کشور ۲۶۱۔ یہ کلیات نول کشور کے ہاں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۰ء میں چھپ چکے ہیں پہلی اشاعت میں ۷۶،
اور دوسری میں ۶۶، صفحات ہیں۔ میں نے اس مضمون کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہے۔ بخیاں اختصار آئندہ صرف شمار صفحات
پر اکتفا کی جائیگی۔ عہ ایضاً کلیات ۱۸۹، لکھ ایضاً کلیات ۱۸۹، عہ کلیات ۱۸۹، عہ ایضاً ۱۲۳
معہ معجم البلدان از یاقوت حموی نزہت القلوب حمد اسد مستوفی ۱۸۹، طبع ملک الکتاب ۱۳۱۰ء بمبئی

نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی۔

خراستان تو ام درجہاں پناہ نیست سرِ ما بجزاں در حوالہ گاہے نیست
 بنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، بنجر را دگاں سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں
 چند قصیدے لکھ کر پیش کیے جن میں سے ایک یہ ہے:
 باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را دیں حال کہ نو گشت زمیں را و زماں را“

شعرالجم ص ۲۶۲

شعر خراستان تو ام الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور انوری سے
 کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

را دگاں سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر درج ہے بے شک انوری کا ہے
 لیکن سلطان بنجر کی تعریف میں نہیں ہے بلکہ عماد الدین پیروز شاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے
 کلیات (مطبوعہ) میں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں مدوح کا نام موجود ہے۔

پیروز شاہ عادل و منصور و مظفر کز عدل و گربا رہ بنا کرد جہاں را (کلیات ص ۳)
 اور یہ شعر بھی ہے

دستور جلال الوزرا کرد رعایش انصاف رساند ہر انصاف رساں را یہ
 قولہ ”ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں، لیکن یہ کسی سے
 نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیا جہ کہتے ہیں اس کو کبھی اٹھا کر دیکھ بھی
 لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے۔

خسروا بندہ را چودہ سال ست کہ ہی آرزوے آں باشد
 کز ندیمان مجلس انشود از میقان آستان باشد
 اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداً نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد
 لکھا گیا ہے، (شعرالجم ص ۲۶۵)

اگر واقعی سبب پیش تر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوچا ہے تو وہ تہ ذل سے مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن
میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملہ میں پروفیسر برون کی تاریخ ادبیات ایران کے مہون منت ہیں اگرچہ
بظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر برون کے الفاظ ہیں:
” امرنی الواقع یہ ہے کہ قصیدہ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیش تر
سے مشق سخن میں مصروف تھا۔ اشعار

خسروا بندہ را چودہ سال مست کشم ہی آرزوے آں باشد
کز زمینان مجلس انشود از میقان آستان باشد “

(تاریخ ادبیات ایران ص ۳۸، طبع ۱۹۰۶ء)

قولہ ” رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سبخر نے بہ آں جاہ و جلال دودفعہ انوری کے مکان پر جا کر
اس کی غرت افزائی کی “ (شعر الجم ۲۶۶)

دس سال کی اُمیدواری کے باوجود حبیباً کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہے انوری سبخر کے دربار میں
منادمت بر طرف، مقیم آستان بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کر سکا اور اگر اسی رفتار سے اُس نے ترقی کی ہے تو
سبخر کو اُس کے گھر آنے کے لئے عمر نوح درکار ہے۔

میں سبخر اور انوری کے تعلقات کی بابت اسی مضمون کے دوران میں کسی موزوں مقام پر گفت گو کروں گا
یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انوری کے گھر سبخر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر
ہے کہ ایک مرتبہ کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیر مقدم میں نقیدہ قطعہ اور
رباعی لکھے ہیں چنانچہ رباعی

منصوبہ ہرگز در آمد بضمیر کاید بدرت موکب میمون وزیر
ہیں کوکب غنچہ یا و دست بوس ہاں دست چار گو یا دست گیر اکیلات ۵۶ء طبع و نکش

کسی اور قطعہ میں کہتا ہے

بچیزے دیگر ایں بشریف را تشبیہ تو اس کرد حدیث مصطفیٰ میلاں و بوا یوب انصاری و علیہ السلام

قطعہ ذیل بھی ملاحظہ ہو ۵

لے خداوندے کہ بنائے جبال عینی خدا
گو ہر پاک ترا اصل نکو کاری نہاد
آستانِ ساحتِ جاہ ترا چوں بر کشید
عقلِ کلی پائے برخاکش بہنواری نہاد
فتنہ را خوابِ ضروری دیدہ از گشتی بدو
چوں قضا در دیدہ بختِ تو بیداری نہاد
وے حیاتِ نو نہاد سے مراد تن چنانک
باللہ ار در خاک ہرگز ابر آذاری نہاد
عذر آن اقدام چوں خواہم کہ خاکش را سپر
سر مہ چشم خداوندی و جباری نہاد
شاد باش لے مصطفیٰ سیرت کہ خلقِ طاعت
بے تکلف بر تکبر داغِ بیزاری نہاد
از شرف در عرضِ من عرفی نہاد سے چنانک
مصطفیٰ دنسل بوا یوب انصاری نہاد (ص ۶۳۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے ۵

زہ از کلکت اندر چشمِ دولتِ کل بیداری
بعونش کردہ مدت با جہانباں جہا نذاری
یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے، رباعی بالا کے علاوہ ذیل کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے
مجیر دولت و دینی و اندر دیدہ دولت
زرے لست بنیائی ز بختِ تست بیداری
تو آن صدری کہ عالم را کمال آمد وجود تو
نگر تا خویش تن را کمتر از عالم نہ پنداری
ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ۵

ترا لطف تو داعی بود اگر نہ کس روا دارد
کہ رخت کبریا ہرگز بچوناں کلیہ آری
نزولت را بہ نزد من مثل دانی چہ می آم
نزول مصطفیٰ نزدیک بوا یوب انصاری (کلیات ۳۴۰-۳۴۹)
”قولہ“ انوری جس طرح سحر کے دربار میں پھنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے
شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی
کہ دربار کا ملک الشعراء امیر مغزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا
اس کا حافظ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں قصیدے کا قصیدہ یاد کر لیتا
تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو مغزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ

میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھ کر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا
انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پیٹھے پڑانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر، مغزی
کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی طرح میں قصیدہ لکھ کر لایا ہوں آپ پیش
کرادیجئے، مغزی نے پوچھا کیا لکھا ہے پڑھ کر سناؤ، انوری نے پڑھا
زہے شاہ وزہے شاہ وزہے شاہ زہے میرو زہے میرو زہے میر
مغزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا ہے

زہے شاہ وزہے شاہ وزہے شاہ زہے ماہ وزہے ماہ وزہے ماہ
انوری نے ہلکی ہلکی باتیں کیں، مغزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے
کہا، اکل آنا، انوری دو سرور زچھنچا تو مغزی خود ساتھ لے کر دربار میں آگیا اور کہا کہ
جو قصیدہ تم نے صبح میں لکھا ہے، سناؤ۔ انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا
گردل و دست بحر و کاں باشد دل و دستِ خدا نگاہاں باشد
شاہِ سخنر کہ کتریں خدش در جہاں بادشہ نشاں باشد
دو شعر پڑھ کر گیا اور مغزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی
اشعار سنائیے۔ مغزی چپ ہوا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا سخنر نہایت محظوظ ہوا اور
نہیمان خاص میں داخل کیا۔“ (شوالجم ۶۶ و ۶۷)

پروفیسر برون نے اس قصے کو حبیب السیر سے متاثرہ نقل کر کے اس پر کوئی تہقین ظاہر نہیں کیا ہے میں اس
خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں علامہ شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیئے ہیں۔ میں اس
روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ ایک مرتبہ کے
سننے میں کامل قصیدہ ازبر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کر لیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ
کی سماعت میں حفظ ناسکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان بوجہ سہتیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی
خاندان میں ہوتا ہے قطع نظر کر کے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے نہ صرف اس قصے

بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر مغزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے۔۔
 بر سر من مغزی کردی کلہ داں برگزشت
 بگزر و بطلیب نام نیز دور مجری
 شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں:-

” دریں بیت رمز آنست کہ امیر مغزی بحضرت انوری از روئے حسد تمہتے دروغ کردہ بود
 پیش پادشاہ تعریف کردہ کہ انوری شہر بلخ را بچو کردہ پادشاہ بد و متقلب شدو حکیم انوری
 را مقنعہ زنان پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر سر سوار کند و گرو دشمن
 بگرداند چون حکیم مذکور اس قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبرائے بلخ تعریف کرد باز دشمنند
 و بخر سوار نہ کردند و مہربان شدند “

حالانکہ امیر مغزی ۵۴۲ھ میں سمرکند کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور ہجرت کا واقعہ سنہ (۵۵۲ھ) کی
 وفات کے بہت عرصہ بعد طغرل لگین کے دور میں ہوتا ہے۔

شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے بشعر یہ ہے۔
 کس انم از اکابر گردن کشان نظم
 کو را صبح خون دو دیوان گردن ست
 شادی آبادی کہتے ہیں۔

” امیر مغزی کہ سر آمد شعرائے زمانہ بود و پیش سلطان سنجر مرتبہ و تقرب بسیار داشت
 از دیوان مولانا احمد معالی (بلعالی نحاس) [دزدیدہ است و ہر دو دیوان را
 ہلاک کردہ است و دیوان خود ساختہ است “

علاوہ بریں ہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابو الفتح ناصر الدین طغرل
 ابن مظفر ابن نظام الملک (۵۲۵ھ و ۵۲۶ھ) تھا حکایات میں اس وزیر کی مح میں بیسیوں قصیدے اور
 قطعات ہیں اس نے قوی احتمال کیا جاسکتا ہے کہ ایسے طاقتور وزیر کے مقابلے میں امیر مغزی کی کوشش دربار
 میں انوری کی رسائی کے برخلاف چنداں سرسبز نہیں ہو سکتی تھی۔

قولہ ” انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سب سے زیادہ

ہرج میزن میں جمع ہوئے، انوری نے اس جہل پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان
آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر، نہ خانے اور سرد آب طیار کر آ
اور تاریخ مقررہ پر ان میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوا
سنح نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔
فرید کا تب نے اس پر قطعہ لکھا ہے

گفت انوری کہ از جہت باد ہائے سخت ویراں شود عمارت و کہ نیز برتری

در سال حکم او نوزیدست یسج باد یا مزل الراج تو دانی و انوری (شعر العجم ۴۶۶)

یہ سبھی سارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیونکہ اس کا انتقال

۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع بسند زہمت القلوب حمد اللہ مستوفی ۸۱۱ھ میں اور بسند کامل ابن الاثیر
۲۹ جمادی الآخر ۵۵۲ھ کو ہوتا ہے۔

فی الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہنچے۔ کلیات میں
پسر میراد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان
کی شدت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز
طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا۔ وہ ایک طوفان کا ضرور منظر تھا لیکن نہ ان خوف ناک
نتائج کے ساتھ جو بالعموم اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ تلمیح شعر ذیل میں ملتی ہے۔

آباد دار نیم خود از جہاں بداد طوفان باد نیمہ خود کو خراب خواہ کلیات ۳۶۳
مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے۔

آباد دار ملک زمین خسروا بداد طوفان باد ملک ہو گو خراب خواہ ۳۶۳

طوفان کا ذکر اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و

جدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے۔ اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر برون نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے
سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

وہی قطعہ جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے قصائد ظہیر میں بھی موجود ہے و ہوندا۔
 میگفت انوری کہ شود باد ہا چنانک کوہ گراں ز پلے در آید چو بنگری
 سالے گزشت و برگ نخبید از دخت یا مرسل الیاح تودانی و انوری
 (قصائد ظہیر ص ۱۳۸، طبع نول کشور ۱۳۸۸ء)

تیاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے۔
 اتجمل اختران دانی کہ در میزاں چرست خود نکودانی کہ آن صنعت چہ نیکو کردہ اند
 از براس ذرّہ خاک کف پائے ترا نقدِ ہفت اقلیم گردوں در ترازو کردہ اند (قصائد ظہیر ص ۱۳۸)
 ظہیر نے طوفان کے بطلان میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں
 رسالے تہ کہ ز انشاء خود فرستادم بمجلس تودر ابطال حکم طوفانی
 اگر در آں سخم شبے ست و یخواہی کہ از جریدہ ایام نیز بر خوانی
 مرا چنان کہ بود ہم معیشتے باید کہ بے غذا نتوان داشت روح حیوانی
 (قصائد ظہیر ص ۱۴۱)

ظہیر حین ایام میں طوفان کی نزاع میں مصروف تھا آذربایجان میں مقیم۔ قزل ارسلان ۵۸۲ھ میں قتل ہوا
 ہے اور نظامی کا مدوح ابو بکر نصرۃ الدین اس کا جانشین ہوتا ہے۔ قطعہ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرۃ الدین معلوم
 ہوتا ہے۔ شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پیشین گوئی میں کہا تھا کہ طوفان باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی
 اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا لیکن میرے ساتھ جس نے اس کی پیشین گوئی کی تردید کی ہے اور
 ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

شما ہا ز کوہ گوش زبان را زدی نقطہ بشنوزمن سوائے و تشریف دہ جواب
 آنکس کہ حکم کردہ بطوفان باد و گفت کاسیب آں عمارت گیتی کند خراب
 تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاہ در بند آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب
 من بندہ چوں خطاے وے ابطال کردہ ام بامن چرا ز وجہ و گرمی رود جواب (قصائد ظہیر ص ۱۴۳)

قولہ ” انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترک ملازمت کر کے فیثاپور چلا آیا۔ اب اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امر اور دُسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے، ۳۳ھ میں سلطان احمد پرویز شاہ نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سُن کر کہ دریائے جیحون راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچ کر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا مطلب کی بات اس طرح ادا کی۔

ایں حال کہ در بلخ کنوں دارم از خوف پریشانی و گمراہی
زیں پیش اگر وہم و گماں بردے آں محطے کو نہ نظر ساہی
بر عمرہ جیحون نہ با موزش چوں بط بہ طبیعت شدے راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے، (شعر ۳۶) یہ خیال کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سبخر کے دربار سے قطع تعلق کر کے فیثاپور چلا جاتا ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ سبخر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔

سلطان احمد پرویز شاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطائی شہزادہ تھا اور سبخر کے عہد سے آٹھ نو سال بعد خراسان کے بعض حصے جن میں بلخ اور ترمذ قابل ذکر ہیں اس کے تصرف میں آجاتے ہیں جن میں موخر الذکر مقام کو وہ اپنا پایہ تخت بنالیتا ہے وہ کوئی سبجوتی شہزادہ نہیں تھا انوری کے شعر سے واضح ہوتا ہے۔

ز شیر بیشہ سبجوتیاں بیک جولان شکارے کہ بعد سال کردہ بر بودہ ۳۶

لیکن خوارزم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انوری اس کو خطائی مانتا ہے بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور اس وقت ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقوفوں پر انوری

پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے پر اپنا افسوس ظاہر کرتا ہے شعر

تو میروی وزین وزماں ہی گویند زبہ زعدل تو خلقِ خداے آسودہ ۳۶۲

پیروز شاہ جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام بنالیا ہے انوری جو ان ایام میں بلخ میں قیام پزیر ہے اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اپنے بعض قصائد میں ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً:

قسم ز خدمت تو بدوری چرا فتاد گفت انوری بہانہ چہ آری گناہ تست

گفتم کہ آب جیوں گستاخری مکن بگز کہ عالمے ہمہ آب و گیاہ تست

گفتم کہ عالمے خلے بہت گفت نیست عیب از خیالماے دلغ تباه تست

یوسف نہ ویرن اگر نہ بہ گفتمے کا نذر از اے مجلس شب بلخ چاہت ۳۵

ایک اور قصیدے میں جو عماد الدین پیروز شاہ کے بلخ چھوڑنے کے سات ماہ بعد لکھا جاتا ہے

انوری کہتا ہے ۵

خسرو امن بندہ را در مدتِ این ہفت ماہ گرمیہ گشتے اندر ہفت کشور یا ورے

تا مرا از بچہ دریائے حرمای دوست دای فی الملئ بر تختہ بروے کشان تا معبرے

مہمتی از بس کہ سر بر ہستانت سودے چوں دگر اباے جنسِ خویش کنوں سروے

لیکن از بس قصداں ناقص عنایت وز محاماندہ ام در قعر دریائے غنا چوں لنگرے ۳۶۳

پیروز شاہ آخر کار اپنے وزیر جلال الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہے۔ وزیر انوری کے نام فرمان طلب

روانہ کرتا ہے۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے بعض اشعار حوالہ قلم ہوتے ہیں۔

مثال عالی دستور چوں بہ بندہ رسید قیام کرد و بہو سید و برد و دیدہ نہاد

مرا بخد مت شہ خواندہ کہ خدمت باد کند سپہر کہ بہت او زمانہ را بنیاد

عماد دولت دیں اں کہ حصن دولت دیں پس از دفر خرابی از و شدہ نداد

شہ مظفر پیروز شہ کہ فتح و ظفر ز سایہ علم و شعلہ سنانش زاد ۶۳۱

علامہ شبلی شاعر کے طلب کئے جانے کی تاریخ ۵۳۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ انوری کا بیان

اس کے متعلق بالکل صاف ہے شعر

اندر آمد ز درِ حجرہ من نیم شبے روزِ بہنجنہ یعنی دوم بہمن ماہ
سال بد پانصدویں و تہ ماہِ ربیع الثانی گفت برخیز کہ از شہر بردن شد تیرہ ۳۵۷

شاعر کا مقصد یہاں سن یزدجودی سے ہے جو ان ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا۔ سن ہجری اس وقت ۳۵۶-۳۵۷ء کے مابین ہونا چاہیے۔

قولہ ”اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت

دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا۔

اس کے ساتھ طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی، زرا کسی سے رنج ہوا اور اس نے

ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانے کو دشمن بنالیا تھا، (شعر الجہم ۲۶۹)

اس پر محکوم ایک انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ ”پہلے کتے کو بدنام کر دو پھر شوق سے اس کو پھانسی دو“

ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کمترین اوصاف کو خوب

چمکایا جائے اور اصلی کمال سے اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشہ خاطر میں ظہیر فریابی کے مبالغہ آمیز

احترام نے اپنا گھر بنالیا ہے اس لئے غیب انوری کو مشکل سے بیرون آسماں جگہ دی جاتی ہے۔ دو تلواریں

تمام دنیا جانتی ہے ایک نیام میں نہیں آتیں اسی لئے محکوم حیرت ہے کہ انوری کو شعر الجہم کے مشاہیر میں کیوں

داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ بے مہر مادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا۔

انوری کے کمالات سے جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری

کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت

کا شاذ ارثوث دیا ہے مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطیف مضامین پیدا کرتا ہے لیکن طبیعت کا

دنی اور تنگ ظرف ہے۔

معتقدین کے بیانات نیز کلیات کے تتبع سے یہ امر محقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا

ہجو اتفاقاً انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہوا

ہجو کندی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنالیا میرے خیال میں واقعات پر مبنی نہیں۔ انوری فرشتہ نہیں تھا انسان تھا، بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہے اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہے لیکن اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ زیادہ وسیع تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ صدر اور امرا اس کی عزت کرتے تھے۔ سلاطین اور وزرا اس کا احترام کرتے تھے ان میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں۔ میں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) قاضی حمید الدین صاحب مقامات حمیدی (الموتوفی ۸۵۹ھ) اس عہد کے نہایت مشہور شاعر فاضل اور ادیب ہیں۔ انوری سے ان کا رشتہ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پھونچا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں۔ انوری کے ایک قطعہ کے جواب میں جس سے شبلی نے دو شعر نقل کئے ہیں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

مرا انوری آں چو دریا تو نگر ہی از سخن زادہ کاں فرستد

چو بے برگیم گشت اور امقصد ز خلد بر نیم ہی خواں فرستد

جو ہر گنج را جائے ویرانی آمد از اں گنج خود سے ویراں فرستد

بمانا دآں دوست کو دوستان را غذائے دل و راحت جاں فرستد ۶۶۴

ایک موقع پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہے اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کر سکتا ہے کیوں کہ وہ قادر مطلق ہے لیکن دیکھا جاتا ہے کہ مشیت الہی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

او صد الدین کہ در سوال جواب بدھداد علم و بستاند

بہ بزرگی جواب ایں فتویٰ بکند چوں بفضل بر خواند

آں کہ داند کہ حال عالم چیست پس تواند کز اں بگرداند

ہم بر آں گر بماند از چہ بود عقل اینجا فرو ہی ماند ۶۶۵

انوری جواب دیتا ہے۔

لے بزرگ جہاں حمید الدین کہ خرد میخ تو ہی خواند
واکھ از بیچ روئے نتوان گفت کہ نداند ہی و نتواند
ماندیک چیز آں کہ خود نکند گرچہ جانے تواند و داند
زاں کہ بر بے نیاز و جبست کہ بے نفع کس قصار اند
لم در افعال او نیاید ازاں کہ سبب در میانہ نشاند
غنی مطلق از غرض و درست فعل او کے لفضل ماماند

بیچ تدبیر نیست جز تسلیم خویش را پیش ازین نبخاند ۶۲۵
(۲) شجاعی ایک شاعر ہے جو انوری کو لکھتا ہے۔

لے انوری توئی کہ بفضل و مہر بوند احرار روزگار و افاضل تر اہی ۶۲۶
اور جواب میں انوری لکھتا ہے۔

شجاعی لے خط و شعر تو دام و دانہ عقل ہزار مرغ چمن صید دام و دانہ تو
میں بخوف طوالت صرف ایک ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں پورے قطعوں کے لئے کلیات ملاحظہ ہو۔
(۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المسالکی سے انوری کی گہری دوستی تھی وہ کہتے ہیں

سلام علیک انوری کیف حالک مرا حال بے تو نہ نیک است بارے

(۴) ارشد الدین ایک اور شاعر ہے جس کے قطعہ کے جواب میں انوری لکھتا ہے ۵

بیچ دانی ارشد الدین کنز کف و طبع تو دوش من چہ شر بہتہ آں زندگانی خوردہ ام ۵۱

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہے اس کے قطعہ کے جواب میں انوری لکھتا ہے ۵

شعراے کمالی آں بہ سخن پائے طبعش سپرہ فرق کمال ۶۲۷

(۶) ایک اور شاعر انوری کو اپنے گھر بلاتا ہے

ادھ الدین انوری لے من مرید طبع تو وے ہوائے عشق و مہر تو مراد طبع من

ہم بیہیم دولت وصل تو اندر ریح خویش
(۷) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا انوری کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے

اے درہنہ صفت اعیان روزگار در نظم و نثر اخل و حسان روزگار
آسان بر نفاذ تو دشوار اختراں بیادیت ضمیر تو پنهان روزگار
حلم ترا کمانہ ہی کرد ناگماں بگست ہر دو پلہ میزان روزگار
اخلاق تو سواد ہی کرد لطیف تو پر شد بیان دفتر دیوان روزگار
باعقل ترساں ترساں گفتم کہ درشنا آنرا کہ مہمت دیدہ اعیان روزگار
لقمان روزگار رش خوانم چہ گفت نے جز انوری کہ زبید لقمان روزگار ۱۵۵

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہے

فرخندہ اوصد الدین فرزانه انوری لے آنکہ از دو عالم وحدت منورست
(۹) سراجی شاعر ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہے

سراجی لے زمیقمان حضرت ترمذی رسید نامہ تو ہچو نامہ زہبت ۶۶۳
(۱۰) ایک وزیر دربار سے آنکھ اپنے محل کی طرف جا رہا تھا دامن پانویں الجھا کر پڑا۔ انوری نے
اس موقع پر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہے

صاحباً سقطہ مبارک تو نہ ز آسیب حادثات رسید ۶۳۸
وزیر قطعہ کا جواب قطعہ میں دیتا ہے میں ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں
گرچہ شب سقطہ من ہر کہ دید پارہ از روز قیامت شمرد ۶۶۹

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انوری نے زمانہ کو
اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہے کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاذ مانا گیا ہے لیکن انوری اس کی طرف بھی اپنی دوستی کا ہاتھ
بڑھانے کے لئے طیار ہے۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہے

آدم باغے کہ جان ببرد گرز لطف تو نگار آید گرفتاری زد و ستار تو بندہ را نیز دوستدار آید

یا نیز دیک اور دم روک کہ برو زیم یک و بار آید ص ۲۴۵

کسی اور موقع پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے کہتا ہے۔

اے جو بخت سروے کنید یوں تو فزائے چشم عالم پیر بندہ را خضم اگر بیش تو کرد نقش عنوان نامہ تر ویر

مالش آں بس کہ تا بختربانہ بگینہ مست شربت تشویر مبرائیش از عطائے بزرگ اے بزرگ جہاں بجرم حقیر

زانکہ جزو ست جود تو نکشد پائے ظلم و نیاز و زنجیر مادرے پیر در دود و طفل از جہاں نفور و جفت نفیر

ہمہ گرباں لقمہ از امید ہمہ عریان جامہ از تدبیر غم دل کردہ بر رخ ہر یک صورت حال ہر یک تصویر

دست اقبال از نہ بکشاؤ بنداد بار این محفل فقیر گا و دو شاہ عمر و ندہ زیں پس از شکال عاودہ شیر (۱۵۴)

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر فیاض جذبات کا

اظہار کرتا۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہے کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سحر حبیب جلیل القد

سلطان دومرتبہ اس کے گھر جاتا ہے اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم ظرف اور بدحوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دنیا کو

اس کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

قولہ ”سلطان علاء الدین ملک الجہاں سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے

سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہاں کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار

میں بھیج دو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ

انوری کو لکھو کہ میں آپ کے طے کا مشتاق ہوں۔ فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا

اس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں

لکھ سکتا تھا۔ اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔

ہی لدنیا تقول بلاء فیہا حذر حذر من بطشہ و شکلی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا،

(شعر البعم ص ۲۴۵)

مولانا شبلی اس موقع پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی باب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اُس وقت تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لئے کہ شبلی فخر الدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا حالانکہ لباب سے کوئی ایسا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا۔ اس موقع پر لباب کی عبارت ہے :

”بزرگ ملک طوطی بنشت تا آں بلبلستان فصاحت را بنجد مت او فرستد و لطف مجاہلت در میان آورد و چنان می نمود کہ اوراجبت تعہد و تملط استد عامی کند و در ضمیر داشت کہ چون بروے دست یابد اور انکال گرداند و امیر عمیر فخر الدین را ازاں حال علم بود و صورت حال بزرگ اومی تو انست بنشت چہ از سطوت قمر سلطان علاء الدین می اندیشید و مصاوت دوستی باہمال رضائنی داد“ (باب الالباب جلد دوم ص ۱۳۵)

ملک طوطی مروشا جہاں کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار۔ سبخر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے ایک کا نام قرقو تھا اور دوسرے کا طوطی۔ جب ۷۴۸ھ میں ان قبائل نے سبخر کو شکست دے کر اور اسیر کر کے تمام خراسان پر قبضہ کر لیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور طوطی سے ملک طوطی بن گئے۔ انوری جو غزوں سے دلی نفرت رکھتا تھا شومی قسمت سے غز انقلاب کے دور میں کچھ عرصہ کے لئے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بضرورت وقت اس کے مع و ثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں درپردہ تعریفیں مقصود ہے مثلاً یہ شعر

طوطی لے آئے کہ ز انصاف تو ہر نم شبے بلبل شکریہ بوق بر دوز فرمہ را
دیکھو شاہ طوطی کے لئے بلبل لے آیا اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

خسر و صاحبقران طوطی کہ از انصاف او باز را تیمو ہوا خواہ است و شایہں را حام ۲۶۷
شاعر نے پرندوں کا صلح نہیں چھوڑا اور ذیل کی رباعی میں توپورا چڑیا خانہ بھر دیا ہے۔ رباعی
لے زیر ہماں ہمت چرخ دمام کبک از نظرت گرفتہ بابا ز آرام

اقبال تو شاہیں و کبوتر ایامِ سیمرخِ فیضِ خسرو طوطی نام ۵۲

دیوان میں اگرچہ غریبوں کے متعلق کئی تمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کے علاوہ الدین کی جج کے نام سے موسوم کیا جاسکے البتہ ایک شعر ایسا ہے جو علاء الدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کر سکتا ہے۔

کہ لبو رانِ غور کین تو در بمثلِ موشِ بادہ شیرِ نہر است صند
قولہ ” انوری کے مخالف شعر نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ججوں کو کھکھاس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑا تھا چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی جج لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کر دی، اس کے چند اشعار یہ ہیں ۵

چار شہرستِ خراساں را بر چار طرف کہ وسطِ شاں بہ مسافت کم صد و صدیت
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد نہ چنان بہت کہ آبتنِ دام و ددیت
بلخ را عیب اگر چند باو باش کند بر ہر بے خردی نیست کہ صد بخر و نیست
مصر جامع را چارہ نہ بود از بد و نیک معدنِ زر و گوہر بے سرب و بستد نیست
جنڈا شہر نشا پور کہ در فلک خدائے گر بہشتِ ست بہین ست و گر نہ خود نیست
اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو کپڑا کر تھمتہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ توبہ پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقاماتِ حمیدی ہے اور جن کی شان میں انوری نے کہا ہے ۵

بہرِ و ثنا گر کئی رائے نطمے نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن بہ مدحِ جنابِ حمیدی اگر وحی باشد ہر آساں فرستم
انھوں نے انوری کی حایت کی اور اس کی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے ۵

اے مسلماناں فغاں از دور چرخِ چنبری

یوں کہ انوری کے بچانے میں ابوطالب نعیم، صفی الدین عم، مفتی تاج الدین، حسن محاسب
نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے
اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبتہ الاسلام ہے میں اس کی ہجو کیوں کر
کہہ سکتا ہوں؟ (شعر العجم ۲۷۰۲)

ہجو بلخ کے اصل واقعات، ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی
قصیدہ ہے جو سوگند نامہ درباب نفی ہجو بلخ کے نام سے مشہور ہے میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت
اسی سوگند نامہ سے کام لوں گا۔

سنجری وفات کے بعد جب خراسان میں انقلاب پر انقلاب آرہے تھے اور آئے دن حکمران بدل رہے
تھے انوری بلخ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ ان دنوں طغرل تغین کا عہد حکومت تھا جیسا کہ شاعر سوگند نامہ کے
مقطع میں کہتا ہے۔

جب تازیانہ رخ ایں انشا کہ فرماندہ بہ بلخ رایت طغرل تغین بودہ است ورائے ناصری ص ۳۲
اس فرماندہ کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے۔

چنانچہ انوری ص

نیک اگر در دولت سنجر با خبر برگشت شد جواں بار در گرد دولت طغرل تغین ص ۳۳

علی ہذا ہجو بلخ کے واقعے کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ بالعموم ہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ انوری کے
آخر حصہ عمر سے تعلق رکھتا ہے جس کے بعد وہ غرلٹ نشین ہو جاتا ہے۔ پروفیسر برون اور میرزا محمد قزوینی
اس واقعہ کا ظہور انوری کی پیش گوئی کے غلط ثابت ہونے کی پاداش میں بتاتے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں
کہ وہ انوری کی غرلٹ گزینی سہبت ہمیشہ ظہور میں آیا ہے۔ انوری کی تشہیر سلطان سنجر الموتوی ص ۵۵۲ اور
قاضی حمید الدین الموتوی ص ۵۵۹ کے سینین وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ
قاضی حمید الدین شاعر کو بلخ کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں۔ سوگند نامہ میں صرف ”صود“ کے لفظ سے یاد

کیا گیا ہے شعر

باز داں آخر کلام من ز منحولِ حسود فرق کن نقش الی راز نقشِ آذری

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آرہی ہے

تا تو فرصت جوے گردی و زکین گاہِ حسد غصہ دہ سالہ را با من بصرِ آذری

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ صاحبِ خرنامہ نے جو بقول شادی آبادی حکیم سوزنی ہے اس کی ہجو کی ہے سو گزنامہ شعر

بچوں مرا ورا واضع خرنامہ گیر در لیش گاؤ گا و اور در خرمن من باشد از ... خری

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ”ہجو بلخ“ کوئی اور چیز ہے اور ”خرنامہ“ کوئی اور چیز ہے اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں ہجو بلخ ہے نہ خرنامہ۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلمات سے خرنامہ کے چند اشعار نقل کئے ہیں چونکہ موجودہ مذاق کے معیار سے لپٹ ہیں لہذا قلم انداز کئے جاتے ہیں صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر میاں لکھ دیا جاتا ہے۔

آں سر خراں بجائے نماید سر خری پر مغز خر شود ہمہ دیوانِ دفترم

شادی آبادی سوزنی کے دیوان سے امیر مغزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کر کے یہ غلط نتیجہ منسبت کرتے ہیں کہ ہجو بلخ کا واضع خود امیر مغزی تھا لیکن امیر مغزی ۸۷۴ھ میں وفات پاتا ہے امیر الدین فتوحی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشتِ ازبام ہے اسی لئے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قلم اس کے نام پر ڈالا ہے۔

آدم بر سر قصہ، ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں سو گزنامہ میں شاعر نے اس قدر کہا ہے بیت

بر سر من مغزی کوفے گلہ واں برگزشت بگزرد بر طبلِ غم نیز دورِ معری

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہے کہ بلخیوں نے انوری کو تختہ بکلاہ کیا اور عورتوں کی اوٹھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی۔ شادی آبادی کہتے ہیں کہ امیر مغزی کی شکایت پر یہ تشہیر بادشاہِ عہد کے حکم سے

دفع میں آئی۔

لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجد الدین کی مدح میں ہے اور جس کا مطلع ہے:

انکوں کہ ماہ روزہ بقصان در اوفاد آہ از حجاب حجرہ دل بردار و فاد ۹۷
اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا۔ غوغائی اس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تحریف

توہین دیں عمل میں آئی تھی شاعر مجد الدین کو خطاب کر کے کہتا ہے ۵

اسحق محال نیست کہ بندہ چو دیگران از عشق خدمت تو بدیں کشور اوفاد

اور اکہ شکر ہائے شکر ریز شعر ہاست زہرے بدست واقعہ در شکر اوفاد

از حضرتے حشر بدیش حاضر آمدند ناویدہ مرگ در فزع محشر اوفاد

تیمارش از تعرض ہر بے خبر فرو دستارش از عقیقہ صد معجز اوفاد

بشنو کہ در عذاب چگونہ رسید صبر بگر کہ در خلایب چگونہ خر اوفاد

با شکران عقل درین خطہ کار او داند ہی خدائے کہ بس منکر اوفاد

کا فور در غذاش با فطار ہر شبے از جور او (؟) بمومن بر کافر اوفاد

از بس کہ بار داور ی این آں کشید اور سخن بحضرت این داور اوفاد ۹۸

اس در طے بلا سے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں سو گندنا

میں جن بزرگوں کا نام بسبیل تذکرہ آیا ہے اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علمای جمع ہیں ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ بلخ کی ہجو کا خیال دل میں بھی لاسکوں اس کے متعلق سو گندنامہ کے بیانات بالکل صاف ہیں۔

با چنین سخاں اگر از قدر شاں عقدے کشند فارغ آید چرخ اعظم از بے زیوری

ہجو گویم بلخ را ہیبت یارب زہینار خود تو ان گفتن کہ ز نگارست زر جعفری ۱۰۱

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں شبلی ان کو نظام الدین احمد درس کہتے ہیں لیکن ان کا پایہ

اس سے درجہ افضل و ارفع معلوم ہوتا ہے۔ شادی آبادی ان کو ضابط بلخ کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ

قاضی القضاۃ ہیں۔ سو گزنامہ

افتخار خاندان مصطفیٰ در بلخ و من کردہ ام در خدش حسانی و ہم بوتری
 آن نظام دولت مدین کا نظام عدل او در دل اعصاب کند باد صبارا رہبری
 در پناہ سدرہ جاہ رعیت پرورش بر عقاب آسمان فناں دہر کیکری
 ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی و حسب کو سیماں تا دور انمشت کش کند انمشتی
 مسند قاضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ آن کہ مہت از منشدش عباسی الہ برتری
 آنکہ پیش لک و طبعش آن دوسر آنکہ حلال صد چمن بہمن چوں گوسالہ پیش سامری
 آج آتش را اگر در مجلس حاضر کنند از میان ہر دو بردار و شکوہش داوری ضحہ

قاضی حمید الدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی الدین عمر کا ذکر کرتا ہے۔ شعر العجم میں انھیں ”صفی الدین عم“
 کہا گیا ہے لیکن سو گزنامہ:

خواجہ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع آنکہ خود دیورا در سایہ او قادری ضحہ
 کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے:

زمانہ گزراں بس حقیر و مختصر است ازین زمانہ دوں در گزر کہ در گزرت ضحہ

تاج الدین کے بعد مجد الدین ابوطالب کا نام آتا ہے غالباً یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مدحیہ قصیدے سے چند
 اشعار اوپر درج ہوئے ہیں۔ شبلی ان کو ابوطالب نعیم کہتے ہیں۔ سو گزنامہ:

مجدیں ابوطالب آن عالم کرہ گمشدہ درو (کذا) عقل کل آن کردہ از بیرون عالم اطہری ضحہ
 شعر العجم میں ایک اور نام ملتا ہے ”حسن محسب“ مگر سو گزنامہ اس سے واقف نہیں ہے۔

قولہ ”بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزین ہو کر مٹیہا، سلطان غوری جہان سوز نے
 دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا۔

کلبہ کا ندو بروز بہ شب جائے آرام و خور و خوابست جاگیدہ دارم اندر و کازو چرخ در عین رشک تاب سنست
 ہرچہ در مجلس ملوک بود ہمہ در کلبہ خواب سنست رعل اجزاء و نان خشک در گرد خان من و کباب سنست

قلم کو تہ و صریح خوش زخمہ و نغمہ رباب منست خرقہ صوفیانہ اطلس از ہزار اطلس انتخاب منست
 ہر چہ بیرون بود ازین کم پوش حاش لسا معین غدا منست خدمت پادشہ کہ باقی باد نہ بیازے آب و خاک منست
 زین قدر راہ جہنم بستہ است آن کہ او مجمع و آب منست وین طریق از نمایش سفت ظا حکم اس خطا صواب منست
 نیست ایس بندہ از زبان جوآ جامہ دلبے من جواب منست شعر العجم ۲۷۲

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ بروایت مشہور علاء الدین غوری سے صاف
 نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی غلط نہیں رہے کہ اگرچہ غوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے
 اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم غوری ۶۱۰ھ میں سلطان علاء الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور یہ بھی
 یقینی ہے کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مع سرائی اور شعر گوئی سے تاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد
 قصائد اسی پیروز شاہ کی مع دشنامیں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصہ میں لکھے گئے ہونگے۔ لیکن علاء الدین غوری
 جہاں سوز ۷۵۰ھ میں وفات پاتا ہے اس لئے غوری کی عزت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا نامکن ہے۔
 قطعہ بالا میں غوری جس پادشاہ کی خدمت سے دستکش ہوتا دیکھا جاتا ہے وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے
 اس کے گہرے اور دیرنیہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصہ تک رہ چکا ہے کیونکہ یہ طلبی کی تحریک
 ایک عرصہ تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں غوری کا آخری جواب
 اور پادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے درج کئے جاتے ہیں:-

خسرو اور زے زعمم گر سپہ افزوں کند تا نگیرد بستہ مرگم چوں گس راعنکوت
 گر تو انم سجدہ گاہ شکر سازم ساقش چوں مسح مریم از صفر حل تالیے حوت
 پس چگوئی صرف یارم کرد بردر گاہ تو ہر یکے زین روز ہار از پے یکروزہ قوت
 طالب مقصود را یک سمت باید مستوی مرد را سرگشتہ دارد اخلافاً سموت
 من چو کرم پلیدم قانع بیک نوع از غذا تو اماں با صبر چوں و تر ضیفی با قنوت ۶۲۶

پادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن شمن کے بجائے مسدس ہے۔

لے بتو مخصوص اعجاز سخن چوں بو تر آئی و در معنی قنوت

سمت درگا ہمت سحر چرخ را گشتہ درد دوراں گل خیر السموت
 با چو قرص ارزن دوت غدیہ تو چو قرص آفتاب و برج حوت
 صموہ ما مرغ سیمرغ تو نیست تو قوی باز و بفضل و مابقوت
 پیش نظم چوں نیج الوحسہ تو چیت نظم مایج العنکبوت
 گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست بے سمن غنہ و قصہ بے کروت
 راسہ عالی در جواب ایں مند لایق اینجا السکوت ست السکوت ۵۹۵

قولہ ” انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد

خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا “ شعر الجم ۲۷۳

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے پروفیسر برون پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے
 ہیں۔ آتش کہ قلمی ۵۵۶ھ اور طبع ممبئی ۵۵۹ھ تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ، مرات انجیال شیرخان
 لودھی ۵۴۹ھ، ہفت اقلیم ۵۵۸ھ، مجمل نصیحی ۵۵۵ھ، خلاصۃ الاشعار ترقی کاشی ۵۵۸ھ، اور مرات العالم
 ۵۹۲ھ -

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے چونکہ طوفان باد کے سلسلہ میں انوری کا نام بھی
 لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہے اس لئے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔
 حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا فرار سرفاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم
 دفن ہیں بتاتا ہے اور کیسی قدر حیرت خیز ضرور ہے اس لئے کہ شاعر کا اکثر حصہ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے۔ اور آخر
 - عمر میں تبریز جا کر کیا کرتا۔

قولہ ” انوری کا اصلی مایہ فخر جو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر جو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو

انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، ناور، باریک اور لطیف
 مضامین پیدا کئے ہیں، ان ہجو میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط
 ہے صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا

جو کلام زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سیکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدہ آذر موجود ہے ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ جو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صدمہ کا تقاضا کیا، اس کے بعد سچو کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے۔

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را یکے میخ و دو گز قطعہ تقاضائی
اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا ازیں سہ بیت دو گز فتم دگر چہ فرمائی،

شعر البوم ۲۸۳

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں مثلاً اوصاف نگاری یا مداحی، اخلاقیات و نید و حکم اور مباحات اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہم معان مانا گیا ہے۔ مولانا شبلی بر خلاف مذہب جمہور اس کو سچو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے نہ انھوں نے قصیدہ گوئی کی اہم دقائق، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہے۔

مولانا نے انوری کا کلیات بحشم خود نہیں دیکھا ہے۔ محض اس انتخاب کی بنا پر جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے سیکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہے تو یہ صاحب آتش کدہ کی بداندازی کا قصور ہے جس نے زیادہ تر ایسا کلام پسند کیا یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موقعہ اور عاجزانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دور ہے۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیے وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہے۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چن سکتا ہے اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل دریا صین کثرت کے ساتھ نظر آتے ہیں البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں ہے جس کے مولانا شبلی بدعی ہیں اور یہ خیال تو قطعی غلط ہے کہ اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے۔ انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابل اعتراض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے۔ دشنام دہی میں کسی لطافت خیال اور دقت نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس لئے اس صنفِ سخن میں شاعر کی قوت تخیل کے کارناموں کی تلاش کرنا میرے خیال میں بے سود ہے انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا اس کی فحش نگاری کی تعریف کرنا۔ اس کے اخلاقیات کو پس پشت ڈال دینا اور اس کی ہجویات کو اچھالنا ایک ایسی عجیب تحسین ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں گزری ہے۔

بخون غلیظہ دست و تیغ غازی ماندہ بجیس تا اول زیب اسب و زینت برگستوان بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہے اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ناظرین انداز کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی بُعد ہے اس اچھے خاصے قطعہ پر یہ کلنگ کا ٹیکا ناحق لگایا گیا ہے اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کر لی گئی تو میرے خیال میں مولانا کی ثقاہت کے اعلیٰ معیار تک کو ذی مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدا نظر آتے ہیں شجر ممنوعہ قرار پاتا ہے۔

ذیل میں اسی ذخیرہ سے جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے چند منتخب جو مذاقِ حال کی رو سے قابل اعتراض نہیں پیش کی جاتی ہیں۔

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں ابوعلی آبی نام کا ایک عمدہ دار رہا کرتا تھا بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوعلی آبی کی ناک اس کے منہ پر بیجا تناسب کثیر الخم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرہ پر چھا گئی تھی۔ انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے جو ذیل کی رباعی میں دیتا ہے رباعی

بابوعلی آبی ارہم بہ نشینی شخصے بینی شش جہش زو بینی

گردیدہ بدینِ خوش چار کتی چندان کہ ازو بینی بینی بینی
ایک مرتبہ سرخس میں امساک باراں ہو گیا اور بارش دیر میں ہوئی۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے
انضمام سے یہ لطیف حاصل کیا ۵

سرخس از پنج بے آبی و آبی در یغار وئے دارد در خرابی
ز بے آبی خلاصی یافت مہال خداوند خلاصش وہ ز آبی
یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی
الہی اس کو آبی سے بھی پاک کر

خواجہ ابو الفتح کے نجل کی تئیر ۵

خواجہ ابو الفتح از کمال حرص و نجل سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہی گوید ز نش ربنا انزل علینا کما نزلہ ۵۸
ممدوح کو جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہو چکا ہے یوں خطاب کرتا ہے۔

خداوند اہمی دانم کہ چہ نیست در دست گرم چہیزے نداستی بدین تقصیر معذوری
ولیکن گر کہے پرسد چہ دادست رواداری کہ گویم عشوہ اول روز و آخر روز دستوری ۵۵
اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لئے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں
بادیا! تو کہے کیا کہوں؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی۔
نجیب مشرف اور فرید عارض؛

چہ خیر باشد در لشکرے کہ نیز درو نجیب مشرف و عارض فریدنگ بود
شکت پائے یکے، زودیکہ دیکہ خیر کہ دست دگر نیز زیر سنگ بود ۶۵
ایک قرآن خواں قاری کی قرأت انوری کے لئے ناخوشنودی کا اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر
بنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے ۵
دوش در خواب من ہمپیر را دیدمش کو ز اُمت آزرده است

گفتش لے بزرگ چت بودہ است طبع پاک تو از پیہ پر مرده است
گفت زین مقرر یک ہی جو شمش رونق دین ایزدی برده است
آنچه ایں زن بمزد می خواند جبرئیل آں بمن نیاورده است ۶۱۲
کسی وزیر کو جس سے انعام کی امیدیں شاعر یاس سے ہمدوش ہے یہ مشورہ دیا جاتا ہے۔

تو وزیر ی و منت مدحت گوے دست من بے عطا روا بینی
شو وزارت بمن سپار و مرا مدخے گوئے تا عطا بینی ۶۱۹

تم وزیر ہو اور میں تمہارا تاج سخت افسوس ہے پھر بھی خالی ہاتھ رہوں۔ اس صورت میں تجویز کرتا ہوں کہ وزارت تم میرے حوالہ کر دو اور شاعری میں تمہارے سپرد کروں پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دوں گا۔
تاج الدین عمزاد جب زیارت بیت اللہ سے واپس آتا ہے انوری اس کے خیر مقدم میں کہتا ہے
عمزاد زنج باز رسید نبوی باتورہ طاعت و انہان کرامت

انوری کے ہاں بچہ بحیثیت مجموعی اگر دکھایا جائے تو دس بارہ آدمیوں سے زیادہ کی نہیں ملے گی ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقوفوں پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہے۔ ان بد نصیبوں میں ایک قاضی طوس ہیں، نمبر دوم سدید الدین بہیقی، نمبر سوم تاج الدین عمزاد اور نمبر چارم کافی ہروی ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

چار کس بابی کہ در حوین اند گر بجوئی از ثریا تا نثری
قاضی طوس و سدید بہیقی تاجک عمزاد و کافی ہروی

۵۳

قولہ ”انوری کے دیوان میں چند چوہیں انوری کے بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوری کو بچو کا ایسا چھکا پٹگیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا لیکن اور شعرا نے یہ چوہیں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دی ہیں اور چونکہ بیابک اس کی دشمن تھی وہ اسی طرح قائم رہ گئیں“

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں اگر تذکرہ نگار ہیں تو باید جو متحد تذکرے دیکھنے کے مجھ کو اس قسم کا کوئی
 بڑا چار نظر نہیں آیا۔ بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی۔

انوری زن ازاں سبب نہ کند کہ مبادا ز نش پسر زاید
 کسی دوست کو جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے جواب دیتا ہے

بجائے کہ بے ارادت ا و خلق را رنج و شادمانی نیست
 کاندہیں روزگار زن کردن بجز از محض قلبتانی نیست



خطبات دہاسی

(مترجمہ جناب نواب سہو جنگ بہادر، ناظم تعلیمات، حیدرآباد دکن)

خطبہ پنجم

(تاریخ ۲۴ دسمبر ۱۸۵۴ء)

سنسکرت جو قدیم آریاؤں کی زبان تھی، ہندوستان یعنی سرزمینِ ہفت دریا یا سہ پتائیہ کو (جو ویدوں کا نام ہے) عام زبان کبھی نہ ہونے پائی۔ ڈراموں (ناٹکوں) میں خاص خاص اشخاص سنسکرت بولتے ہیں۔ لیکن عورتوں اور عوام کی زبان معمولی بولی ہے جسے پراکرت کہتے ہیں۔ پراکرت کے معنی ناتر شیدہ بولی کے ہیں۔ اور سنسکرت کی ضد ہے جس کے معنی شائستہ زبان ہیں۔ پراکرت جو دلی میں ہمیشہ بولی جاتی تھی جیسا کہ خود اہل ہند کا بیان ہے اور جو بھاشا یا بھاکا ”یعنی معمولی بولی“ کے نام سے موسوم تھی، آخر سنسکرت پر غالب آگئی اور اسے ”ہندوستان کی زبان“ (ہندی) کا نام دیا گیا جو سنسکرت کو کبھی نہیں ملا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آنے شروع ہوئے سب سے بڑھ کر محمود غزنوی نے اس ملک میں ستائیس کے قریب شاندار کامیابیاں حاصل کیں اور اس وقت سے شہروں میں ہندوستانی بھاکا کے صورت میں تغیر تبدیل پیدا ہوا۔ چودھویں صدی میں تیمور لنگ

۱۵ یعنی پانچ دریا پنجاب کے اور ان کے علاوہ سندھ اور سرسوتی۔

۱۶ ان ناٹکوں سے قبل بدھ لوگوں کی کہن بوں اور اشوک کے کتبوں کی زبان ایک قسم کی پراکرت ہے جو اس وقت عام

طور پر بولی جاتی تھی۔

۱۷ ملاحظہ ہو اصل دیباچہ بلخ و بہار اور دیباچہ آثار الصفا وید جن کا اقتباس آگے دیا گیا ہے۔

ہندوستان میں آیا۔ اور دہلی پر قبضہ کر کے اس نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی جسے بابرنے ۱۵۱۹ء میں منظم طور سے قائم کیا۔ اس وقت ہندوستانی زبان (ہندی) فارسی زبان سے متاثر ہوئی اور فارسی الفاظ اس میں بکثرت داخل ہو گئے۔ خود فارسی زبان میں بوجہ اسلامی فتح اور مذہب کے میثار عربی الفاظ آگئے تھے۔ اور اس عجیب و غریب سے موجودہ ہندوستانی سامی اور حامی امواج کی سنگم بن گئی جو لسانی ترکیب کے لحاظ سے نہایت عجیب و غریب ہے۔ اسی طور سے ہندوستانی اسلامی زبان کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک تو شمال کی زبان جو اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ کیونکہ اُس نے اردو کے محلی (شاہی چھاوئی) میں جسم لیا تھا۔ دوسرے وسط اور دکن کی جو دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس طرح دو ہندوستانی بولیاں پیدا ہوئیں جو اگرچہ ایک دوسری سے مختلف تھیں تاہم ان میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان کی یہ زبان جسے خاص طور پر ہندوستان کی زبان کہا جاتا ہے۔ ہندی اور اردو بولیوں میں تقسیم ہو گئی جس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ کیونکہ عام طور پر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو مسلمانوں کی۔ یہ واقعہ اس قدر صحیح اور سچا ہے کہ جن ہندوؤں نے اردو میں انشا پر دازی کی ہے انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی طرز تحریر کی نقل کی ہے بلکہ اسلامی خیالات کو بھی یہاں تک جذب کیا ہے کہ اُن کے اشعار پڑھتے وقت بالکل اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کسی ہندو کے لکھے ہوئے ہیں۔

عام طور پر ہندی شاعری میں بہ نسبت اردو یا دکنی شاعری کے زیادہ قوت اور زور پایا جاتا ہے۔ یہ عربی کی قدیم شاعری سے ملتی جلتی ہے جو انھیں صفات سے ممتاز ہے۔

مدت دراز تک ہندو سنسکرت میں اور مسلمان فارسی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ البتہ مشہور و مقبول گیت معمولی بولیوں میں بولے اور لکھے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ عمدہ عمدہ کتابیں بھی ہندوستانی بولیوں میں لکھی جانے لگیں جن کی وجہ سے بقول ولسن کے جو ہندوستانی السنہ علوم کے بڑے عالم ہیں۔ ان بولیوں میں خاصا علم ادب پیدا ہو گیا جو بہت دلچسپ ہے۔

اردو کی بحث پر ہمارے ہم عصر سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں یہ لکھا ہے۔

”ہندوں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ ۱۱۹۱ء موافق ۱۲۴۸ء بکراجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہو گیا مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ ۱۱۹۸ء ہجری مطابق ۱۲۰۵ء تک بجز شاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوں میں سے کائستوں نے جو ہمیشہ سے امور ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوں میں رواج ہو گیا۔

اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پھر جب امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زمانہ سے یعنی حضرت مسیح سے تیرہویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے۔ اور کچھ پہیلیاں اور کمریاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے۔ جب کہ شاہجہاں بادشاہ نے ۱۶۰۰ء ہجری مطابق ۱۶۰۰ء عیسوی کے شہر شاہجہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی۔ اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدل ہو گیا۔ غرض کہ لشکر بادشاہی اور اردو معلیٰ میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی۔ اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا، پھر کثرت استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہو گئی یہاں تک کہ تخمیناً ۱۶۰۰ء ہجری مطابق ۱۶۰۰ء عیسوی کے یعنی اوزنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔

اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں دلی نے شعر کہا، مگر خود دلی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے کیوں کہ اس کے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طنز نکلتی ہے۔ مگر اُس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دکن بدن

اس کو ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تیر اور ستودانے اس کو کمال پر پہنچا دیا۔
آخر میں جس زمانہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس سے قبل حاتم اپنے ”دیوان زادہ“ کے دیباچہ میں لکھتا ہے (یہ تحریر سنہ ۱۷۷۷ء کی ہے)۔

میں نے تحریر کے لئے وہ زبان اختیار کی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں کی زبان ہے یعنی ہندی، جسے ہاکا کہتے ہیں، کیونکہ اسے عام لوگ بھی بخوبی سمجھتے ہیں اور بڑے طبقے کے لوگ بھی پسند کرتے تھے۔

درحقیقت جو کچھ سید احمد نے لکھا ہے وہ سب کا سب بالکل صحیح نہیں ہے۔ اہل مشرق میں یہ خوبی شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ ان میں تخیل اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے ہر پہلو کی تحقیق نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے سید احمد نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کی بعد سے یعنی ۱۱۹۱ء سے ۱۶۴۸ء تک ہندوستانیوں کی زبان میں کوئی تفسیر نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف میر اسحاقؒ یہ کہتے ہیں۔

”جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدر دانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال و جواب کرتے ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی۔“

اس پر کچھ اور بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔ گیارہویں صدی کے آخر سے قبل شاید سنہ ۱۷۷۷ء میں مسعود بن سلمان نے ریختی میں دیوان مرتب کیا۔ ریختی سے مطلب وہی ہے جو سید احمد نے بیان کیا ہے یعنی ہندی جس میں فارسی الفاظ کی آمیزش ہو۔ بالفاظ دیگر اردو۔ علاوہ اس کے بہت سے ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے ریختی کے بعض اشعار سہمدی سے بھی منسوب کئے ہیں جو دکن میں سنہ ۱۷۵۰ء اور سنہ ۱۷۸۸ء کو درمیان لکھے گئے ہونگے

۱۔ ملاحظہ ہو بلخ و بارکادیا پچاس ۱۔ ہندوستانی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ سہمدی ۱۰۳ سال زندہ رہا (سنہ ۱۷۵۳ء اور سنہ ۱۷۹۹ء) تیس سال تعلیم میں بسر کئے، تیس سال سفر میں اور تیس سال عزلت، تعلیم کے تیس سال میں بچپن کے تیرہ سال جمع کئے مادیوں تو ۳۴ سال ہوتے ہیں اس حساب سے سنہ ۱۷۵۳ء اور سنہ ۱۷۸۸ء کے درمیان جب وہ سفر کر رہے تھے اس وقت انھوں نے ریختی کے وہ اشعار لکھے ہونگے جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

کمال اپنے دیوان میں سعدی کو موجود زبانِ رخیہ کہتا ہے لیکن اس کے بیان کی صحت کے لئے چاہئے کہ ”وسط ہندیا وکن میں“ کیونکہ سو برس پہلے مسعود رخیی میں نظم لکھ چکا ہے بہر حال یہ اُس کے بعد کی بات ہو کہ خسرو اور نور می نے نظمیں لکھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر وسط ہند میں خاصی بولی جس کا نام دکنی ہے، رخیی میں نظم لکھی گئی اور اس کا اثر شمال کے شاعروں پر بھی ہوا جو اس وقت تک عموماً فارسی میں لکھتے تھے اور وہ بھی معمولی زبان میں نظمیں لکھنے لگے۔ سولہویں صدی میں ہم کئی مشہور دکنی شعراء کا نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شایان گوکنڈہ، قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن جس کا تخلص تانا ہے۔ ان کے علاوہ افضل دلی، نوری، غواصی، رسمی وغیرہ ہیں۔ حالانکہ شمال میں ہم اٹھارہویں صدی میں بھی شکل کسی مشہور رخیہ گو کا نام پاتے ہیں۔ غالباً حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا ہے، دلی کا پہلا شاعر ہے۔ اُس نے حقیقی اردو میں شاعری کی ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے کہ دہلی میں دلی کے دیوان کے پہنچنے کے بعد اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ اُسے اس زبان میں لکھنا چاہئے اور دوسرے شاعروں نے اس کی تقلید کی۔

مشہور گلکرسٹ نے جو انگریزوں میں ہندوستانی کے مطالعہ کا بانی ہوا ہے، ۱۸۲۵ء میں ایک دیسی تذکرہ کا ذکر اپنی صرف و نحو میں کیا ہے اور اُس وقت سے مجھے اس زبان کی ادبی تاریخ کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے تحقیق و جستجو کے بعد سات دیسی تذکرے ہم پہنچائے اور باوجود نا کافی سامان کے میں نے ۱۸۳۹ء میں ہندو می اور ہندوستانی ادب کی تاریخ شائع کی۔ یہ تالیف اگرچہ بہت ناقص ہو۔ تاہم پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی ہے اور اس قابل سمجھی گئی کہ ہندوستانی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اور اُس نے انگریز متشرقین میں بھی شوق پیدا کر دیا۔ میری اور اُن کی مشترکہ تحقیق نے اور بہت سے تذکروں کا پتہ لگایا جن سے میں ابھی پوری طرح کام نہیں لے سکا اس لئے کہ بعض اُن میں سے اب تک مجھے نہیں ملے بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذکر دیسی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے اور بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا بھی تک علم ہی نہیں ہے۔

یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس تاریخ کے نئے ڈیٹیشن کے لئے کس قدر نئے سامان کی ضرورت

ہے لیکن میں مختصر طور سے یہ بیان کروں گا کہ اہل ہند کے ان تذکروں سے ہم شعرا کے حالات اور تصانیف کے متعلق کس قسم کا مواد جمع کر سکتے ہیں۔

ایرانی - اور (ان کی تقلید میں) ہندوستانی مسلمان تذکرہ نویس اور خاصکر ہم عصروں کے حالات لکھنے کے بہت شائق ہیں۔ ان میں کسراتی ہے جو ہم میں بھی پائی جاتی ہے کہ تاریخ و فات کا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ تذکرے کسی تجارتی خیال سے نہیں لکھے جاتے بلکہ ادب کی اہم شاخ ہیں۔ ان میں مولفین کو اپنی نصاحت و بلاغت دکھلانے کا خوب موقع ملتا ہے اور مشہور شعرا اور دوستوں کی تعریف بڑے مبالغہ سے کرتے ہیں اور انتخاب کلام سے اپنے ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ حالات جو تذکرے کہلاتے ہیں ایک قسم کے انتخابات ہیں۔ جن میں مصنفین کے حالات مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ حالات کئی کئی صفحوں کے ہوتے ہیں جو شاندار الفاظ اور سچیدہ ترکیبوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ صرف مصنف کا نام لکھ دیا جاتا ہے پہلی قسم کے حالات میں تعریف کے بعد دس بیس یا تیس صفحوں میں کلام کا انتخاب ہوتا ہے اور دوسرے قسم کے حالات میں دو تین شعر اور بعض اوقات صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے۔ یہ تذکرے ایک طرح سے اپنی روشناسی کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں کیوں کہ مولف تذکرہ مصنفین کے حالات میں موقع بے موقع اپنا نام بھی داخل کر دیتا ہے اور اکثر ضربانی سے اپنا ذکر بھی کر جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیقی حالات اس طرح لکھ جاتے ہیں جو انھیں دوسروں کے لکھنے چاہئیں تھے اور اُس کے ساتھ ہی کثرت سے اپنے اشعار بھی نقل کر دیتے ہیں۔ یورپ میں عام دستور یہ ہے کہ کم و بیش مشہور اشخاص کے حالات لکھتے وقت نہایت احتیاط کے ساتھ ایسی تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں جن سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں اس قسم کے تمام تفصیلی حالات ترک کر دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کی جاتی۔ ان تذکروں میں قدیم شعرا وہ ہیں جو مولف کے زمانے سے پہلے گزرے ہیں اور ہم عصر شعرا بدیع شاعر خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں تاریخ و سنہ اور خاصکر سنہ پیدائش خال خال کہیں کہیں آجاتا ہے اہل مشرق میں اس کا بہت کم رواج ہے اور عموماً وہ اپنی عمر تک نہیں جانتے۔ اس لئے مجبوراً طرز تحریر

دوسرے قرائن سے یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس صدی کا شاعر ہے۔ اور اکثر کتابوں کے تصرف اور تغیر و تبدل سے اس کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

بہر حال مولفین تذکرہ اکثر غیر معروف شعراء اور بعض اوقات نامعلوم حضرات کے ناموں سے اپنی کتابوں کا حجم بڑھا دیتے ہیں، جس طرح ہمارے سیرت نویس اپنی کتاب کی جلدیں بڑھانے کے لئے غیر معلوم اشخاص کا نام کھود کھود کر نکالتے ہیں۔

اسی طرح یہ تذکرے تنقید کا عمدہ نمونہ نہیں ہیں۔ اتفاق سے جب کبھی دو یا کئی شاعروں کا نام ایک ہی ہوتا ہے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے اور تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل پڑ جاتی ہے غرض یہ کہ تذکرہ ایک خاص قسم کی تصنیف ہے جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ضمنان تذکروں سے بہن مشاعروں کے متعلق بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مشاعرے ایک قسم کی مجلسیں ہیں جو اردو شاعری کی حصول و ترقی کی غرض سے قائم کی جاتی ہیں۔ اور وہاں شعر ایک دوسرے کے مقابلہ میں فی البدیہہ یا ہم طرح اشعار کہتے ہیں۔ ان مشاعروں میں جو شعر کے ممتاز باشندوں کے ہاں منقذ ہوتے ہیں، پندرہ سے بیس تک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ عموماً شرفِ ملک میں سے ہوتے ہیں۔ مولوی کریم الدین نے جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا، حال میں دہلی کے ایک خاص رسالہ میں جس کا نام گل رعنا ہے ان نظموں کو شایع کیا ہے، جو ان مشاعروں میں کسی گئی یا پڑھی گئی تھیں، ان کے علاوہ ایسی مجلسیں بھی ہوتی ہیں جہاں قصہ خواں اپنے قصے سن کر حاضرین کو لطف اندوز کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے دہلی میں ایک قصہ خواں مرزا حسن نامی تھا جس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ان قومی قصوں کو لکھ ڈالے جنہیں وہ بڑی خوبی سے بیان کیا کرتا ہے۔

عموماً یہ تذکرے شعرا کے تخلصوں کی ابجدی ترتیب کے لحاظ سے مرتب ہوتے ہیں۔ پہلے تخلص ہوتا ہے اس کے بعد نام۔ اس کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی دوسری ترتیب ہوتی ہے۔

ان ہندوستانی تذکروں میں بہت سی فاسی میں لکھ گئے ہیں۔ کیونکہ زمانہ حال تک اس قسم کی چیزیں ہندوستانی

مسلمانوں کی علمی زبان ہی میں لکھی جاتی تھیں، جیسا کہ ایک زمانے میں ہمارے ہاں رومن یا لاطینی زبان میں لکھنے کا دستور تھا مثلاً ڈوبلے نے فرانسیسی صرف ونحو اور پٹراک نے اپنی قابل تعریف اطالوی نظموں پر لاطینی میں حواشی لکھے۔

میں نے ہندوستانی تذکروں کی سیرت نویسی اور ان کے عیب و صواب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک نمونہ میں ایک ہندوستانی تذکرے سے نقل کرتا ہوں، میں نے دو مثالیں منتخب کی ہیں، ان میں سے ایک مختصر اور دوسری طویل ہے۔ تذکرہ کا مصنف مرزا علی خاں لطف ہے اور تذکرہ کا نام گلشن ہند ہے۔

میں پہلے مختصر مثال کو نقل کرتا ہوں، جس میں باوجود نہایت اختصار کے وہ حاتم کو جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، ایک مشہور شاعر بیان کرتا ہے۔ اس کے حالات دوسرے تذکرہ نویسوں نے زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔

”حاتم تخلص، شاہجہاں آبادی، مشہور رنجیہ گویوں میں سے دلی کو تھے۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبادی اور میرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا، صاحب دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خریج ابہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ابہام کا“ اس کے بعد حاتم کے کلام سے ۲۰ شعر نقل کئے ہیں جو میں نے بطور نمونہ دوسری جگہ درج کئے ہیں۔ دوسری مثال میں ایک بادشاہ شاعر یعنی ابوالحسن بادشاہ گوکنڈہ کی پیش کرتا ہوں۔ جو سنہ ۷۳۰ (۱۶۷۳ء) میں تخت پر بیٹھا اور جب اوڑنگ زیب نے سنہ ۷۹۹ میں گوکنڈہ فتح کیا تو اسے قید کر دیا اور وہ قید ہی میں سنہ ۷۹۹ میں انتقال کر گیا۔ یہ اپنے پیش رو عبداللہ قطب شاہ کی طرح ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، تانا یا تانا شاہ تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی شاعر کا قدردان اور سرپرست تھا۔ چنانچہ اس کے عمدہ واروں میں سے ایک شخص مرزا (ابوالقاسم) کا ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ دکن میں اپنے زمانہ کا نہایت مشہور شاعر تھا۔

”نام نامی اور اسم گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تانا شاہ ہے۔ سلاطین نامدار

اور خوانینِ عالیِ مقدارِ دکن سے تھا۔ اگرچہ شہرِ عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت اور انبساط کا اس عیشِ مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سریرِ آراے بارگاہِ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔

جن ایام میں کہ عالمگیرِ خلدِ مکان نے عادلِ شاہی اور نظامِ شاہیوں کو زیرِ وزیر کیا، اور صوبہ دکن کو بعدِ بیت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسنِ تانا شاہ بھی نظرِ بندی میں آئے، اور فلکِ نیزنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامانِ عیش سب برہم ہوا، اور مجمعِ اربابِ نشاط حلقہٴ ماتم ہوا۔ خلدِ مکان نے جس قدر تنگی اُن کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا۔ لیکن حقے کے مقدمے میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کھلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔

از بسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ ہر نشہ عیش میں محمور رہتا تھا، حقہ ایک دم منہ سے نہیں چھٹاتا تھا اور یہ بھی معمول تھا کہ بعدِ ہر نیم کے ایک ٹیشے سے گلاب کے حقہ تازہ ہو دے، پر ایک ٹیشے میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگو دے۔ شغل میں عیش و نشاط کے از بسکہ دن کو کم سوتے تھے سینکڑوں ٹیشے گلابِ خالص اور عرقِ بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصلِ خلدِ مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا، بارہ سولہ ٹیشے گلاب کے اور آٹھ ٹیشے بید مشک کے حکم فرمائے سبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پر منہ سے نہیں چھٹاتا تھا اور اُن کے دورِ محفل کے رشک سے دہواں حد کا حقہ سیرِ آسمان میں گھٹتا تھا، یا بیچ سے فلکِ حقہ باز کے آٹھ چلیں دن رات میں یہ پتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلدِ مکان نے فرمایا کہ سولہ ٹیشے گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقے کے مصرف میں آنے امرِ اف ہے اور امورِ شرعی میں پاسِ خاطرِ بیجا بیجا، اور تکلفِ رسمی معاف ہے۔ آٹھ ٹیشے ہر روز یہاں سے جایا کریں۔ ایک ٹیشے بعدِ ہر حکم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلیں دن رات میں پیں۔ جب حضور سے آٹھ ٹیشے ہر روز آنے لگے تو یہ دن رات میں لاچار چار چلوں سے دل بہلانے لگے۔

یہ ماجرائیں کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیثوں کی اور تخفیف کی۔ انھوں نے اپنے حقہ بردار کو دو مہلوں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو ٹیشے اور کم ہوئے تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دن ان دونوں شیثوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انھوں نے عرض کیا، جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس مہلے روز خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہے۔ امید ہے کہ بھیدی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہو دے کہ نہال نمک حلالی کا زمین میں سرخروئی کے بو دے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گرا سن کر نہایت آسان ہے۔ تو جو ہمارے مصرت بچا کا کفیل ہوتا ہے، ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پر ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے اور اس سرے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے۔ سبحان اللہ! چشم حقیقت میں سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانہ رحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطف، کیتباد کدھر کہاں سکندر و دارا، کہاں ہے کیا کوس
جو مست جاہ ہیں دکھیں وہ چشم عبرت سے کچھ اُن کے ساتھ گیا غیر حسرت و فوس؟
اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملے کو سمجھنا شاہان عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گہلے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے۔ لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال پادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور کہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ منظمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا نفا ہے تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے۔ کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا اور پادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہتا تھا مال اس مشقت کا عجیبہ نظر آیا کہ اس حسن ترود نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھادیا۔

واقعہ رموز ملک سے ہیں شاہ و شہر یار ہے تو گدائے گوشہ نشین لطف کچھ نہ بول
غرض شاہ عالی جاہ ابوالحسن تانا شاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار
ممدارہ دکن کے اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی

گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے۔

کس درکوں، جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بھراٹ ہے

اک بات کے ہوں گے سجن، یہاں جی ہی بارہ بات ہے

اگرچہ دکن اور وسط ہند کی ہندوستانی شاخ میں شمالی ہند کی زبان یا اردو کی نسبت بہت بڑی بڑی نظمیں موجود ہیں، تاہم اردو زبان کو جس میں غزلوں، قصیدوں اور چھوٹی چھوٹی ثنائیوں کے مجموعوں کو دیوان کے نام سے موسوم کرتے ہیں، زیادہ فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ زیادہ باقاعدہ لکھی جاتی ہے۔ تمام تذکروں میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اردو کے شاعروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور دکنی شعرا کے متعلق سوا سے سرسری ذکر کے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ چنانچہ میر نے اپنے تذکرے نکات اشعار کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں ”اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں از انجا یک شاعر مربوط برخواستہ لہذا شروع بنام انہا نکردہ“ و طبع ناقص مصروف انہم نیست کہ احوال اکثر انہا ملال اندوز گردد۔ مگر بعضے از انہا نوشتہ خواہد شد، انشاء اللہ تعالیٰ“

ہندی شعرا کے الگ تذکرے ہیں جنہیں کب مالا کہتے ہیں۔ مگر مجھے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ بہت ہی کم ہیں۔

ہندوستانی مصنفین کے لکھے ہوئے تذکرے یا انتخابات سب ملا کر ۱۷ ایسے ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ ان تذکروں اور ان کے مصنفین کا تفصیلی حال میری تاریخ ادب ہندوستانی میں درج ہے۔

۲۔ ان شعرا کی تعداد جن کا ذکر تذکروں اور دوسری تصنیفات میں پایا جاتا ہے اور جن تک بلا واسطہ یا بالواسطہ میری دسترس ہوئی ہے، تخمیناً تین ہزار ہے۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ یہ سب کے سب حقیقت میں شاعر تھے، کیوں کہ ایسے مصنفین کا شمار بھی جنہوں نے دوسرے علوم مثلاً قانون اور دینیات پر کتابیں لکھیں ہیں، شاعروں میں کر لیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے

اور اس وجہ سے شاعر کہلانے لگے۔ علاوہ اس کے شاعر کی اصطلاح مبہم سی ہے اس کے معنی مصنف کے بھی ہوتے ہیں، جیسے یورپ میں بعض اوقات عام آدمی اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا ”شاعر“ کو ”مصنف“ کے معنوں میں خیال کرنا چاہئے، اگرچہ ہندوستانی تذکرے زیادہ تر شعرا کے کلام کے انتخابات ہوتے ہیں جن میں ان کے حالات بھی درج ہوتے ہیں، تاہم ان میں ان مصنفین کا بھی ذکر آجاتا ہے (اگرچہ یہ بہت نادر ہوتا ہے) جنہیں ہم مشکل سے شاعر کہہ سکتے ہیں، اور ان کی نثر کی تالیفات کا بھی بیان ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تمام مشرقی ادب میں اور خاص کر ہندوستانی ادب میں شاعری کو سب علوم پر فوق حاصل ہوتا ہے۔ اس سے میرا مطلب محض نظم سے نہیں جو الفاظ کا باضابطہ مجموعہ ہے بلکہ ان موزوں خیالات سے ہے جو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں جو تمدن کی روح رواں ہے اور تاریخ سے کہیں بہتر ان خیالات سے ہیں کسی ملک کے تمدن کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

علاوہ اس کے ہندوستانی نثر کی کتابیں بھی ایک حد تک نظم میں شریک کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ مشرق کے مسلمانوں کی اور زبانوں کی طرح ہندوستانی میں بھی تین قسم کی نثر ہے جن میں سے ہم صرف ایک کو نثر کہہ سکتے ہیں۔ پہلی قسم کو مرزبکتے ہیں، جس میں موزونیت بنیر وزن کے ہوتی ہے۔ دوسری متبحر ہے جس میں وزن تو ہوتا ہے، مگر قافیہ نہیں ہوتا۔ تیسری عاری ہے جس میں نہ وزن ہوتا ہے نہ قافیہ۔

ہندوستانی کے اکثر شعرا ایسے ہیں جنہوں نے فارسی میں بھی نظمیں لکھی ہیں جیسا کہ پہلے زمانے میں ہمارے ہاں بھی رواج تھا کہ فرانسیسی شعرا اپنی زبان کے علاوہ آسانی سے لاطینی میں بھی شعر کہتے تھے، اور روم میں علاوہ لاطینی کے یونانی میں بھی نظمیں لکھتے تھے۔ اس رواج سے ایک فہرہ رواج نکلا، یعنی جو شاعرانہ زبانوں میں شعر کہتے ہیں وہ تخلص بھی دہرکتے ہیں۔ جن میں سے ایک ہندوستانی میں اور دوسرا فارسی میں استعمال کرتے ہیں مثلاً وجیہ الدین کے دو تخلص ہیں، ایک وجیہ دوسرا بریں۔ اور اسی طرح محمد فاں کے ہندوستانی اور فارسی میں دو آہ اور ثائب دو تخلص ہیں

ہم ان بشیر مصنفین کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلا امتیاز جو بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کہ ہم انہیں ہندو مسلمانوں میں تقسیم کریں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مسلمانوں میں شاڈ ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے ہندی یا ہندی شاخ میں نظم لکھی ہے، حالانکہ بہت سے ہندوؤں نے اُردو نیز دکنی میں نظمیں لکھی ہیں، بعینہ جیسے وہ پہلے فارسی میں لکھتے تھے جیسا کہ سیاح احمد نے آثار الصنادید میں بیان کیا ہے جس کا اقتباس میں اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ تین ہزار شعرا میں سے، جن کے متعلق میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، دو ہزار دو سو سے زیادہ مسلمان ہیں، باقی صرف آٹھ سو ہندو ہیں۔ جن میں سے صرف (۲۵۰) کے قریب ایسے ہیں جنہوں نے ہندی میں نظمیں لکھی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم کے لئے ہمارا علم بہت ناکافی ہے کیونکہ ہندو وی اور ہندو شعرا کے تذکرے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے شاعروں کا نام تک نہیں معلوم ہوا۔ لیکن اُردو شاعروں کی یہ حالت نہیں ہے، کیونکہ اُن کے تذکرہ نویسوں نے اور کچھ نہیں تو کم سے کم نام تو دیدیا ہے، یہ زیادہ تر پنجاب، کشمیر، راجپوتانہ اور سرزمین فصاحت ممالک مغربی شمالی (یہ نام کلکتہ کے لحاظ سے رکھا گیا ہے جو انگریزی حکومت کا مستقر ہے) دہلی، آگرہ برج اور بنارس کے ہندو باشندے ہیں جو اصل اُردو میں لکھتے ہیں اور یہ ہندوستانی کی سب سے فصیح اور شستہ شاخ سمجھی جاتی ہے۔

اگر ہم ان شاعروں کے وطنوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کون سے ایسے شہر ہیں جہاں ہندوستانی زبان کی اسلامی شانیں نہ صرف استعمال کی جاتی ہیں بلکہ بطور ادب کے ان کی تعلیم ہوتی ہے، دکنی بولی سورت، بمبئی، مدراس، حیدرآباد، سری زنگاپٹم اور گولکنڈہ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اُردو دہلی، آگرہ، لاہور، میرٹھ، لکھنؤ، بنارس، کانپور، مرزاپور، فیض آباد، الہ آباد اور سب سے آخر کلکتہ میں جہاں ہندوستانی صوبہ کی ملکی زبان ساتھ ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔

اس نے جو پہلا ہندوستانی نشر نگار خیال کیا جاتا ہے اپنی کتابیں کلکتہ میں لکھیں، وہ باغ وہبار کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ

”سواردو کی آراستہ کر زبان کیا میں نے بنگالہ ہندوستان“

ان شعرا کے محض ناموں سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کون مسلمان ہیں اور کون کون ہند اور خود یہ نام بھی بہت دلچسپ مضمون ہیں اور مطالعہ کے قابل ہیں۔ میں نے ایک دوسرے مضمون میں جس کا عنوان ”مسلمانوں کے نام اور القاب“ ہے اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے یہاں میں صرف اس قدر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان شعرا کے نام بعض اوقات چھ چھ تک ہوتے ہیں۔ ایک علم ہے جو اکثر کسی ولی یا نبی کے نام پر ہوتا ہے۔ دوسرا لقب ہے جو ایک قسم کا اعزازی نام ہے جیسے غلام علی، امداد علی وغیرہ۔ تیسرا کنیت جس سے اہنیت یا ابویت کا پتہ لگتا ہے جیسے ابو طالب ابن ہشام۔ چوتھا نسبت جس سے شاعر کا وطن معلوم ہوتا ہے جیسے لاہوری، تھنجی وغیرہ پانچواں تخلص یعنی وہ نام جو نظم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً عربی یا فارسی کا اسم یا صفت ہوتا ہے، ہندی نہیں ہوتا ہے۔

جس طرح مسلمان اپنے نام اپنے اولیا کے ناموں پر رکھتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کے نام ان کے دیوتاؤں پر ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے نام محمد، ابراہیم، حسن، حسین وغیرہ پر ہوتے ہیں اور ہندوؤں کے ہر، نرائن، رام، لکشمن، گویا ناتھ، گوکل ناتھ، کاشی ناتھ وغیرہ۔ مسلمانوں کے اعزازی ناموں مثلاً عبدالعلی، غلام محمد، علی مردان وغیرہ کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ہاں سیو داس، کرشن داس، ہما دیو داس، کیشو داس، مند داس، ہلہ ہر داس، سورداس وغیرہ ہوتے ہیں۔

ہندو نہ صرف اپنے دیوتاؤں کے غلام ہوتے ہیں بلکہ اپنے دریاؤں اور مقدس درختوں اور شہروں کے بھی داس ہوتے ہیں مثلاً گنگا داس، تلسی داس، اگرہ داس، دوارکا داس وغیرہ۔ مسلمانوں میں ایک اور قسم کے بھی نام ہوتے ہیں جیسے محبوب علی، محبوب حسین، ہندوؤں میں بھی بیعیہ بی نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سری لال (یعنی سری یا لکشمی کا محبوب) ہرنس لال (یعنی شیو کے خاندان کا محبوب)۔

لے یہاں مصنف سے سوچو گیا ہے۔ یہ مثال علم کی ہے

عطاء اللہ، عطاء محمد، علی بخش مسلمانوں کے نام ہیں۔ ہندوں میں اس کے جواب میں بھگوان دت (بھگوان کی عطا) رام پرشاد (رام کا عطیہ) سیو پرشاد، کالی پرشاد ہندوں کے ہاں پائے جاتے ہیں ہندوں کے بعض ہندی فارسی مرکب ہوتے ہیں جیسے گنگا بخش وغیرہ۔ مسلمانوں کے بعض نام آمد، شیر وغیرہ ہوتے ہیں۔ ہندوں کے نام اسی طرح سنگہ پرپائے جاتے ہیں جس کے معنی بھی شیر ہی کے ہیں۔

اب رہا خطاب۔ یہ ہندوں کی مختلف ذاتوں میں خاص خاص ہوتا ہے۔ مثلاً برہمنوں کو چوبے تواری، دوبے اور پانڈے کہتے ہیں۔ چھتریوں کو راجپوت اور سکھ۔ ٹھاکروں کو رائے اور سنگھ دیوتوں (سوداگروں) کو ساہ یاسیٹھ، دو بادان یعنی علما و فضا کو پنڈت اور سین۔ وید یعنی اطباء کو مصر۔ ہندو فقر کو گرد، بھگت، گوسائیں، یاسائیں اور سکھ فقیروں کو بھائی کہتے ہیں۔ مسلمان بھی ہندوں کی طرح چار ذاتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی سید، شیخ، منغل اور پٹھان۔ سید، محمد (صلعم) کی اولاد ہیں۔ شیخ عربی نسل سے ہیں۔ لیکن جو لوگ نو مسلم ہیں وہ بھی اپنے آپ کو شیخ کہتے ہیں۔ منغل اپنے نام سے پہلے مرزا یا نام کے پیچھے بیک لکھتی ہیں۔ انھیں آفایا خواجہ بھی کہتے ہیں۔ پٹھان خان کلاتو ہیں۔ مسلمان فقر کو شاہ، صوفی، یا پیر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ خواتین کو خانم، بیگم، صاحبہ، بی، یا بی بی کے خطابات سے موسوم کرتے ہیں۔

سہری اور دیو ہندوں میں بڑے عزت کے نام ہیں پہلے کے معنی رشی اور دوسرے کے معنی دیوتا کے ہیں۔ یہ الفاظ بعض اوقات گاؤں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ کے ساتھ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ قدیم فرانس میں بھی دیوس اور دیوا کے نام شہروں، جنگلوں اور پہاڑوں کے ساتھ اسی طرح استعمال کئے جاتے تھے یہ ہندی رسم کیلشک زبان اور ڈروڈی مذہب کے تحم کے ساتھ گنگا کے کنارے سے میوز، مارن اور سینٹن تک پہنچی۔

اس زمانہ میں بھی روسی اپنے ملک کو ہولی ریشیا یعنی مقدس روس کہتے ہیں۔

لے یہ ٹیوز فرانس کے دریا ہیں۔

آج کل بھی ہندوستان کے فرماں روا اپنی سلطنتوں کے نامور شعرا یا مقررین کو یا اسلامی خطاب مثلاً سید الشعرا یا ملک الشعرا یا ہندوی خطاب مثلاً کبیشیر یا برکبی عنایت فرماتے ہیں۔

جو ہندو اور دو میں شمر کتے ہیں وہ بھی مسلمانوں کے رواج کے موافق تخلص رکھتے ہیں اور یہ تخلص عموماً فارسی الفاظ ہوتے ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی زبان ہے۔ ایک ہی تخلص ہندو اور مسلمان کا ہو سکتا ہے اور اس لئے صرف تخلص سے یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ شاعر ہندو ہے یا مسلمان ان شعرا میں بعض ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ہندو سے مسلمان ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی مسلمان ایسا نہیں پایا جاتا جو ہندو ہو گیا ہو۔ البتہ ایسا ہوا ہے کہ بعض مسلمان ایسے فرقوں میں مل گئے ہیں جن میں کامل اصلاح ہو گئی ہے اور ہندوؤں سے الگ ہو گئے ہیں مثلاً سکھ، جو ایسے مسلمانوں کو جنہوں نے ان کا مذہب اختیار کر لیا ہے مذہبی کہتے ہیں۔

درحقیقت مسلمان سے ہندو ہونا تنزل ہے اور برخلاف اس کے ہندو کے لئے مسلمان ہونا ایک قسم کی ترقی ہے، کیونکہ اسلام کی بنیاد توحید اور حشر (آئندہ زندگی) پر ہے۔ علاوہ اس کے ہندوستان کے مسلمانوں پر عقلیت کا اثر نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنے عقاید میں ابھی تک ویسے ہی پکے ہیں۔ اگرچہ علماء ہندو مذہب نے ان کے عقاید و رسوم پر ضرور اثر ڈالا ہے اور اب تک روزانہ نئے لوگ ان کے مذہب میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شعرا اسلام اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اپنے اشعار میں توحید کا گیت گاتے ہیں۔ منظر رلالہ کور سین، ایسے ہی لوگوں میں سے ہے جس نے فصیح ہندوستانی میں شہادتِ حسین کو منظوم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجن شاعر اور ایسے ہیں جن کا ذکر ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

ہندوستانی شعرا میں ہم ایسے ہندو بھی پاتے ہیں جو عیسائی ہو گئے ہیں اور سب سے زیادہ عجیب اور شاذ و نادر بات یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی ایسے ہیں جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ شیعہ اپنے تذکرے میں شوکت کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمان تھا بعد میں عیسائی ہو گیا

لے بھگت مل نے البتہ ایک ایسے مسلمان کا ذکر کیا ہے جو ہندو ہو گیا تھا۔

”کہتے ہیں کہ بنارس میں شوکت کا ایک یورپین سے بہت دوستا نہ تھا اور اہل کے اغوا سے وہ اسلام کو ترک کر کے عیسائی ہو گیا۔ خدا اس بلا سے محفوظ رکھے۔ اب اس نے اپنا نام منیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے“۔

ایسی حالت میں نام کا بدلنا ضروری ہے۔ ایک اور ہندوستانی شاعر جس کا نام فیض محمد تھا تبدیل مذہب کے بعد اس نے اپنا نام فیض مسیح رکھ لیا، تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسیحوں کے طرح ہندو نوعیاتی اپنا اصلی نام قائم رکھتے ہیں حالانکہ ان ناموں کے معنی ہندوانہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح زندہ ہندو مصنفین میں ہم بابو سری داس (سری لکشمی کے داس) کا نام پاتے ہیں جنہوں نے مسلمان ہونے کے بعد خدا کی صفات پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام شفاعت رب الامین ہے۔

ہندوستانی تذکروں میں بعض ایسے ہندوستانی شعرا کا بھی ذکر پایا جاتا ہے جو نسلاً یہودی تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مثلاً میرٹھ کا جمال جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، ساٹھ برس ہو کیدر آباد میں تھا۔ دہلی کا جوان (محب اللہ) جو طیب تھا اور عشق کا شاگرد تھا، اور آخر میں مشاق کا جو ایک انتخاب کلام شرا کا مؤلف ہے شاگرد ہو گیا۔

اگرچہ پارسی عوام گجراتی میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تاہم بعض پارسی ایسے بھی ہوئے ہیں جن کا کلام اردو میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بمبئی کے بوٹن جی دوسا بھائی کا شکنتلا نائک ہندوستانی زبان میں شایع ہوا ہے۔

انہیں تذکروں میں بعض عیسائی یورپیوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے گو وہ خالص یورپین نہ ہوں مگر نسلاً یورپین ہیں مثلاً ستمبر یورپین اور سردھنے کی مشہور بیگم شرو ملقبہ زینت النساء کا بیٹا تھا اور صاحب تخلص کرتا تھا۔ اس کا خطاب ظفر یاب تھا، وہ دلتوز کا شاگرد تھا، اس کے اردو اشعار مقبول ہوئے دہلی میں اس کے مکان پر شاعرے ہوتے تھے جن میں شہر کے ممتاز شاعر شریک ہوتے تھے، انہیں میں ایک صاحب سترور بھی تھے۔ جن کی بدولت ہمیں یہ حالات معلوم ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کا خطاب تہ پاکیزہ تھا جو مشرق میں بہت قابل تدرفن خیال کیا جاتا ہے۔ اُسے نقشہ کشی اور موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا

عین عنفوانِ شباب میں شاعری میں انتقال ہو گیا۔

اس کا ایک دوست بل تھمز نامی تھا جو آسیر تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی میں خوب شہرت رکھتا تھا۔ سرور کا بیان ہے کہ یہ شخص فرنگی اور نصرانی تھا اور اس کے اشعار میں جن کا انتخاب اس نے دیا ہو بدت پائی جاتی ہے۔

سرور صنی کے چھوٹے سے دربار میں ایک تیسرا یورپین ہندوستانی شاعر اور تھا جو فرانسیسی تھا۔ وہ اپنے تئیں فراسو یا فرانسو کہتا تھا یعنی فرانسیسی۔ کہتے ہیں کہ وہ بیگم سرور دہنہ کے ایک عہدہ دار آگستے یا گسٹن کا بیٹا تھا۔ وہ اچھے شعر کہتا ہے اور اسی دسوز کا شاگرد ہے جس کے تلمذ کا فخر صاحب کو حاصل تھا اور دہلی کے مشہور شعرا میں سے خیال کیا جاتا تھا۔

اس عہد کے ایک ہندوستانی شاعر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو عیسائی اور انگریز ہے اور جس کا نام ہندوستانی تذکرہ نویس کریم الدین نے جارج بنس شور لکھا ہے۔ تذکرہ نویس نے غلطی سے خاندانی نام کو تخلص (شور) سے ملا دیا ہے۔

ان کے علاوہ ہندوستانی شعرا میں دو اور انگریزوں کے نام پائے جاتے ہیں جو دلی کے رہنے والے تھے۔ ایک آسٹن یعنی اسٹیفن یا اسٹیون جو تثنیٰ تک زندہ تھا اور دوسرا جان تومس یعنی جان ٹامس جو خان صاحب کے نام سے مشہور ہے اور ہم عصر شاعر ہے۔

میں بھی اسی قسم کے ایک ہندوستانی شاعر سے واقف ہوں جس کا نام ڈانس سومبر تھا اور جسے بیگم سرور دہنہ (شہر بیگم) نے گود لیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا نام اکثر انگریزی اخباروں میں آیا ہے کیوں کہ وہ ملکی حقوق سے محروم کر دیا گیا اور اس کے لئے وہ آخر تک لڑتا رہا۔ ڈانس سومبر بلا تکلف اردو شعر کہتا تھا اور پڑھتا بھی خوب تھا۔

ایک مہیشی کا بھی تذکرہ میں ذکر آیا ہے جو ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، اس کا نام سیدی حامد

سلہ میرے اڈیا آئن کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام جان پیٹے (*George Pate*) تھا اور وہ دو غلامانی

فرانسیسی ہندوستانی اور ضلع میرٹھ کا زمیندار تھا تخلص شور کرتا تھا۔ (مترجم)

بہل ہے۔ اس شخص کا نام ان نامور مشیوں کی فہرست میں شریک کرنا چاہئے جو شب گریگوری نے اپنی کتاب ”ادبیات حبشیان“ میں دی ہے یہ حبشی شاعر ٹپنہ کا رہنے والا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلام تھا وہ اس صدی کے آغاز میں ہوا ہے۔

ہندی کے تقریباً تمام شاعر ہندوؤں کے مجدد (اصلاح یافتہ) فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یا تو جینی ہیں یا کبیر پن্থی یا سکھ یا دشنوی، اور ان فرقوں کے بانی یا سرور، نامور سے نامور اور گناہ سے گناہ سب ہندی کے شاعر ہوئے ہیں۔ مثلاً رامانند و لہجا، دریا داس، بے دیو (سنسکرت کی مشہور نظم گیتا گووند کا مصنف) دادو، بیربھان، بابالال، رام چرن، شیونریان وغیرہ ایسے شیوی شاعر جن کا کلام ہندی میں ہے بہت ہی کم ہیں۔ ان میں کے اکثر قدیم زبان اور قدیم مذہب کے دلدادہ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان مذہبی لحاظ سے شیعہ سنی میں تقسیم ہیں۔ لوگ عموماً سنیوں کا کیتھلک مسائل سے اور شیوں کو پرائسٹنٹوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ شیوں نے سنت یعنی ان احادیث کو جو پیغمبر صلعم کے حالات سے متعلق ہیں رد کر دیا ہے۔ مگر ان الفاظ احادیث کو تسلیم کرتے ہیں جو روایت آنحضرت سے منسوب ہیں۔ چارڈن نے جو درحقیقت پرائسٹنٹ تھا۔ اس کے بالکل برخلاف بیان کیا ہے غالباً اس کی وجہ وہ ظاہری مذہبی رسوم ہیں جو شیوں میں پائی جاتی ہیں۔

مسلمانوں میں ڈس سنٹر یعنی عوام کے عقائد سے اختلاف رکھنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بانی کے نام پر سید احمدی کہلاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے وہابی ہیں اور بعض اوقات اسی نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ بہت سے ہندوستانی مصنف اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حاجی عبداللہ، حاجی سہیل اور اور لوگ جن کا ذکر بعد میں آئے گا۔

ہندوستان کے شرما میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں فلسفیوں یا صوفیوں کی بھی پائی جاتی ہے جن میں سے اکثر ولی مانے جاتے ہیں۔ نیز کچھ فقیر شاعر بھی ہیں۔ جن میں صرف فقرا ہی شریک نہیں بلکہ ایسے بھکاری بھی ہیں جو گلی کوچوں میں کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اپنے شرعیت پر پھرتے ہیں۔ ان پر

سے مثال کے طور دہلی کے مکرم (مرزا) اور کمترین (میاں) معروف بہ پیر خاں ہیں۔ کمترین اردو کے ملاء میں بذاتِ خود اپنی غزلیں دو دو پیسے کو بیچتا پھرتا تھا۔

ان بھکاری شاعروں کے ساتھ ساتھ ہم بیچ قوموں میں بھی شاعر پاتے ہیں۔ بعض تو ان میں سے پیشہ ور شاعر ہیں یعنی صاحبِ علم ہیں اور شعر و سخن میں اپنے تمام اوقات صرف کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو محض شوقیہ کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایسے شاعر بھی ہیں جو صاحبِ تخت و تاج ہوئے ہیں اور جن کے اشعار کی نسبت ”کلام الملوک ملوک الکلام“ کہا گیا ہے۔ ان میں علاوہ گو لکندہ کے تین بادشاہوں کے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، ابراہیم عادل شاہ بادشاہ بیجا پور، بدقت پٹو سلطان میسور۔ مغلوں میں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ثانی، اودہ کے بادشاہوں اور نوابوں میں آصف الدہلی غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ ہوئے ہیں۔

آخر میں ہیں ہندوستان کے شعرا میں سے عورتوں کو مردوں سے الگ کرنا چاہئے۔ میں اپنے ایک خاص مضمون میں عورت شاعروں کا ذکر کر چکا ہوں۔

ان شاعر عورتوں میں سے جن کا ذکر میں نے پہلے نہیں کیا ایک شاہزادی خاںم ہیں۔ انہوں نے یہ تخلص اس لئے رکھا کہ وہ اپنے بھتیجے نواب عماد الملک ریس فرخ آباد کے محل میں عام طور پر اسی نام سے پکاری جاتی تھیں، لیکن ان کا خطاب بدرالفا تھا۔

میں امتہ الفاطمہ کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تخلص صاحب ہے۔ مگر زیادہ ترجی صاحب یا صاحب جی کہلاتی ہیں اور اردو شعرا میں اپنی غزل کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ ایک نامور شاعر مومن کی شاگرد ہیں۔ مومن شیعہ کے بھی استاد ہیں جنہوں نے شعر کا تذکرہ لکھا ہے اور جس کا حوالہ میں نے اکثر دیا ہے۔ علاوہ ان کے مومن کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں۔ صاحب کبھی دہلی اور کبھی لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ مرزا خاں نے جو ایک مثنوی ”قول غمیں“ کے نام سے لکھی ہے، اس کی مخاطب یہی

ہے یہ مضمون ”ریویدی ورنیٹ“ کے نمبر ۱۵۷ میں شائع ہوا تھا۔

صاحب ہیں

ایک اور عورت شاعر جو بادیو ہندو نام کے اغلباً مسلمان ہے چمپا ہے۔ اس نے نواب
حسام الدولہ کے حرم میں پرورش پائی اور قاسم نے اس کا نام اردو شعر میں شمار کیا ہے۔
ایک معمولی طوائف جس کا نام فرح یا فرح بخش ہے وہ بھی اردو شعر کہتی ہے، شیفتہ نے ایک
اور طوائف کا ذکر کیا ہے جس کا نام ضیا ہے اور عاشق نے ایک تمبیری کا ذکر کیا ہے جس کا
نام کنچن ہے۔

ایک چوتھی طوائف جس نے ہندوستانی زبان کی شاعری میں زیادہ شہرت حاصل کی ہے جان لے
(میرا یار علی جان صاحب) ہے، وہ اصل میں فرخ آباد کی رہنے والی ہے، مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کر لیا
ہے جہاں اسے ادبی کامیابی حاصل ہوئی۔ اسے بچپن سے موسیقی اور ہندوستانی شاعری اور فارسی
کا شوق تھا۔ اس نے اپنی عمر ہندوستانی شاعری میں صرف کی اور کریم الدین صاحب تذکرہ اسے اپنا
استاد سمجھتے ہیں اور شعر سخن میں اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ ۱۲۶۲ ہجری (۱۸۴۶ء) میں اس کا دیوان
لکھنؤ میں طبع ہوا جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس کی تمام نظمیں زمانہ بولی میں ہیں۔ اس وقت اس
کی عمر ۳۴ سال کی تھی۔

ایک ہندو عورت شاعر کا ذکر میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نازنوں کی رہنے والی ہے، اس کا
نام رام جی اور تخلص نزاکت تھا۔ ہندوستانی تذکروں میں اس کی اعلیٰ قابلیت اور حسن و جمال کی بہت
تعریف لکھی ہے۔ وہ ۱۸۴۸ء تک زندہ تھی۔

ان کے علاوہ دو تین اور عورت شاعروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ ایک تصویر ہے اور دوسری
تریا۔ ان کا ذکر باطن اور کریم نے کیا ہے۔ یاس جس کا نام میاں بانو تھا۔ حیدر آباد کی رہنے والی
بلہ گارمان داسی جیسے محقق سے یہ عجیب کہ اس نے میرا یار علی جان صاحب مخلص بہ جان صاحب کو طوائف سمجھا۔ حالانکہ

خود نام بتا رہا ہے کہ یہ عورت کا نام نہیں ہو سکتا بلکہ یہ حال مضمون کا یہ حصہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے

(ادویر)

تھی اور فیض دہلوی کی شاگرد تھی۔ اس نے ہند نامہ عطار کا ترجمہ کیا ہے۔

ایک دوسری تقسیم ان شاعروں کی سندہ دار ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ تقسیم زیادہ تر قابل لحاظ ہے۔ لیکن اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ خاص کر قدیم شعرا کے متعلق زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ ان کے حالات صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ سب سے اول ہندو شاعر بیٹل۔ گیارہویں صدی (سنہ ۱۱) میں مسلمان شاعر مسعود سعد ہوا ہے جس کے متعلق این۔ بلینڈ (N. Bland) نے ایک مضمون جنرل ایشیاٹک سوسائٹی میں لکھا ہے۔ بارہویں صدی میں چاند ہوا ہے جو راجپوتوں کا ہومر کہلاتا ہے۔ پچاسویں صدی کا شخص ہے جس کی نظمیں سکھوں کی ادی گرنٹھ کا جز ہیں۔ تیرہویں صدی (تقریباً سنہ ۱۳) میں سعدی گرنے ہیں اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے انھوں نے اردو میں بھی شعر لکھے ہیں۔ بچو اور ابھی مشہور شاعر اور کلاوند گرا ہے۔ چودہویں صدی میں دلی کے امیر خسرو اور حیدر آباد کے نوری ہوئے ہیں۔

بلاشبہ ان کے علاوہ ہندوستان کے اور شعرا بھی ہیں جو ان صدیوں میں یا اس سے قبل گرنے ہوئے ممالک متوسط کے کتب خانوں میں بہت سی قدیم ہندی تصنیفات ہیں جن کا حال ابھی معلوم نہیں ہوا ہے۔ بہت سے ایسے گیت بھی موجود ہیں جن سے اس زمانے کا پتہ لگتا ہے۔ جب کہ ہندوستانی زبان بن رہی تھی۔

سولہویں صدی میں جدید فرقوں کے سب سے قدیم بانی پیدا ہوئے جن کی مذہبی زبان ہندی تھی اور جو اس زبان میں بھجن اور اخلاقی نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل لحاظ کبیر ہیں جو سنسکرت کے سخت مخالف تھے۔ ان کے شاگرد نرت گوپال، اس مصنف سکھ ندان اور دھرم داس مصنف امر ل ہوئے ہیں۔ نانک اور جگوداس مشہور و معروف ہیں اور ان کی نسبت میں اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا۔ جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ پالچ، بھگوت کا مصنف ہے اس نے یہ کتاب بچم کی ہندوستانی میں لکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لے سب سے قدیم ہندی شاعروں کا زمانہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں فنکاراچار یہ کا نام لے سکتا ہوں جو سنسکرت کا شاعر تھا۔ اور امر سکھ کے نام سے معروف تھا۔ یہ نویں صدی میں ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندی میں شعر کہے ہیں۔

سوطوں صدی میں ہندوؤں میں سکھ دیو ہوا ہے۔ جس کو حال میں تذکرہ نویس ہر یاد اس نے خاص مضمون لکھا ہے۔ نابھا بھی اسی زمانہ کا شخص ہے۔ یہ ان گیتوں کا مصنف ہے جو بھگت مل کا اصلی متن ہیں۔ ولہجا اور دادو اپنے اپنے فرقوں کے سردار اور مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ بہاری، ست سخی کا مشہور مصنف گرز ہے گنگا داس ماہرن معانی و بلاغت ہوا ہے۔ اور ایسے ہی اور بہت سے ہوئے ہیں۔

شمالی ہند کے مسلمانوں میں علاوہ اور لوگوں کے ایک تو ابوالفضل اکبر کے وزیر ہیں اور دوسرے بایزید انصاری جو روشنائی یا جلالی فرقہ کے سردار تھے۔

دکن کے شعرا میں مفصلہ ذیل نام پائے جاتے ہیں۔ افضل (محمد) جس کا تذکرہ نویس کمال لکھتا ہے کہ ”اُس کا طرز بیان شمسہ نہیں کیونکہ اُس زمانے میں جبکہ اس نے لکھنا شروع کیا، ریختہ مقبول نہیں ہوا تھا اور اسی لئے اُسے مجبوراً دکنی میں لکھنا پڑا“ محمد قلی قطب شاہ، بادشاہ گولکنڈہ جو ۱۵۷۲ء سے ۱۶۱۱ء تک برسر حکومت رہا اور اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ جو ہندوستانی ادب کا مربی و سرپرست تھا

سترہویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں خاص کر دکن میں اصل اردو شاعری کا فروغ شروع ہوا اور زبان کا استعمال باقاعدہ ہونے لگا۔ ہندی شعرا میں صرف سورداس، تلسی داس اور کیشو داس کے ناموں پر اکتفا کروں گا۔ یہ جدید ہندوستان کے مقبول شاعر ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ سورداس سورج ہے، تلسی داس چاند اور کیشو داس ستارے دوسرے شاعر صرف جگنو ہیں جو ادھر ادھر ہر چمک جاتے ہیں۔

اردو شعرا میں حاتم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے آزاد (فقیر اللہ) جو اگرچہ حیدر آبادی تھے۔ مگر دلی میں رہتے تھے اور ان کی نظم نے وہیں شہرت حاصل کی۔ جیون (محمد) جو متعدد مذہبی کتب کے مصنف ہوئے ہیں۔

دکنی شعرا میں یہ لوگ ہوئے ہیں۔ دلی جے باباے ریختہ کہا جاتا ہے۔ ان کے استاد شاہ گلشن احمد گجراتی تانا شاہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، شاہی بھاگ نگری اور مرزا ابوالقاسم جو تانا شاہ کے عہدہ داروں میں سے

تھے، عوری یا ابن نساہی (غالباً یہ دونوں ایک ہی صاحب کے نام ہیں) مصنف پھول بن؛ غوص یا غوصی مصنف طوطی نامہ؛ محقق، دکن کا ایک بہت قدیم شاعر جس کا کلام ریختی میں ہے اور ہندوستانی ریختی سے بہت کچھ ملتا جاتا ہے، خاور نامہ کا مصنف ہی اس کا خلاصہ میں اپنی تاریخ ادب اردو میں دے چکا ہوں (محجاز محمد) اور بہت سے اور۔

اٹھارہویں صدی کے ان تمام ہندوستانی شاعروں کا ذکر جنہوں نے پزیم وطنوں میں شہرت و امتیاز حاصل کیا ہے بہت طویل ہو گا، ہندی شاعروں میں چند کا ذکر کرتا ہوں۔ گپنتی اُس نے ہندوؤں کے مختلف فلسفیانہ عقاید پر ایک رسالہ لکھا ہے۔ بیربھان یہ مشہور فرقہ سادہ کا بانی اور ایک مشہور مذہبی نظم کا مصنف ہوا ہے۔ راجن یہ ایک فرقہ کا بانی جو اسی کے نام سے موسوم ہے اور مذہبی گنجوں کا مصنف ہے۔ شیو زین یہ بھی ایک فرقہ کا بانی ہے اور ہندی نظم میں گیارہ کتابوں کا مصنف ہے۔ وہ ابتدائیں بجائے مہولی گنیش کی حمد و ثنا کے رشیوں کی پناہ سے آغاز کرتا ہے۔

اردو شاعروں میں میں صرف چند نام لوں گا۔ سودا، میر اور حسن جو گزشتہ صدی کے تین نامور شاعر گزرے ہیں۔ جرات، آرزو، درد، یقین، اقبال، امجد دہلی کے، امین الدین بنارس کا اور عاشق غازی پوری۔ دکنی شعرا میں قابل ذکر یہ ہیں۔ حیدر شاہ معروف بہ مرثیہ گو، کیونکہ وہ اپنے مرثیے خود پڑھتے تھے منجملہ اور چیزوں کے ہم اس شاعر کے کلام میں متعدد ایسی نظمیں پاتے ہیں جن کا ارتقا ولی کے دیوان میں نظر آتا ہے۔ نبطیں مخمس ہیں۔ وہ ایک منظوم کتاب تحفۃ الصبیان کا مصنف بھی ہے اس میں کئی باب ہیں اور ہر باب کی بحر جدا ہے اور باب کے شروع میں بحر کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی (سنہ وفات تقریباً ۱۱۵۷ھ) اور غزلت سورتی جو دکن کے مشہور شعرا میں سے ہے (سنہ وفات ۱۱۵۷ھ اور ۱۱۵۸ھ کے درمیان)

انیسویں صدی اور زمانہ حال کے مشہور ہندی مصنفین میں ایک تو بنجٹا اور ہے جس نے رضی عنقاؤں کی تشریح و تفصیل نظم میں لکھی ہے دوسرا دھارام (سیرت نویس) فرقہ رام سینہی کا سردار اور قیسر اُس کا بالین چتر اس ہے۔

اردو میں صہبائی اور کریم نے ان شعرا کے نام لکھے ہیں۔ مومن دہلوی جو بہت ہر گو اور فصیح

شاعر تھا (سنہ وفات ۱۸۵۲ء) ان دونوں صاحبوں کی رائے میں اس کا کلام بے نظیر ہے۔ نصیر (سنہ وفات ۱۸۵۲ء)؛ آتش (سنہ وفات ۱۸۵۲ء) یہ سب صاحب دیوان ہیں اور مقبول شعرا میں سے ہیں، مول چند، جس نے شاہنامہ کا ملخص نظم میں کیا ہے۔ ہمنوں ہم عصر شعرا میں بہت مشہور و معروف ہیں اور ان کے علاوہ کئی اور ہیں جن کا ذکر میں اپنے ابتدائی خطبہ میں کر چکا ہوں۔ دکنی شعرا میں صرف کمال حیدر آبادی اور عبدالحق مدراسی کے نام کافی ہیں۔

جس طریقہ سے ہندوستانی تذکرہ نویس شعر کا ذکر کرتے ہیں اگر ہم اُس پر غور کریں تو آسانی سے اس کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔ وہ شاعر جن کا وہ محض ذکر کر دیتے ہیں؛ وہ شعرا جن کا ذکر وہ ادب سے کرتے ہیں؛ اور وہ شاعر جن کا ذکر بہت ادب و احترام اور تعریف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے متعلق کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا اور بعض اوقات صرف نام، تاریخ ولادت اور کچھ شعرا پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو صاحب دیوان نہیں اور جن کی صرف چند ہی غزلیں ہیں یا جنہوں نے بعض طویل نظمیں مختلف طور پر لکھی ہیں مگر کسی نام سے موسوم نہیں۔ دوسرے درجہ میں ان لوگوں کا شمار کرتا ہوں جو صاحب دیوان یا کلیات ہیں۔ ان اصطلاحوں کی تشریح میں بعد میں کروں گا، تیسرے درجہ میں مصنفین کا ہے جن کی نظم یا شعر کی تصانیف کے خاص نام ہیں۔ اگر وہ ہندو ہیں تو ان کتابوں کے نام عموماً سنسکرت میں ہوتے ہیں اور مسلمان ہیں تو فارسی عربی میں۔

ہندوستانی میں مختلف قسم کی نظمیں مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ یعنی الفاظ معانی پر غالب ہیں۔ غزل میں چھ سے بارہ تک شعر ہوتے ہیں۔ سب کا قافیہ ایک ہی ہوتا ہے اور پہلے دو مصرعوں میں قافیہ کا ہونا لازم ہے۔ مضمون کے لحاظ سے کوئی تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ نظریات اور سنجیدہ ہر قسم کی ہوتی ہیں اور اکثر عاشقانہ اور تصوفانہ ہوتی ہیں۔ یہ پڑارک اور ٹیکسیر کی طرز پر ایک قسم کی سانٹ ہوتا ہے۔ ٹیکسیر نے اس مشہور لاطوی شاعر پڑارک کی تتبع میں سانٹ لکھے ہیں اور شیرینی میں اس سے کسی طرح کم نہیں، لیکن اُس کے ڈراموں کے مقابلہ میں وہ زیادہ مشہور نہ ہونے پائے۔ قصیدہ بھی اسی قسم کی نظم ہے لیکن یہ طویل ہوتا ہے اور کبھی مدح میں اور کبھی ہجو میں اور بعض اوقات کسی دوسرے مضمون پر۔

مثنوی وہ نظم کہ جس کے دونوں مصرعے متقی ہوتے ہیں اردو ہر قسم کے مضمون پر ہوتی بعض وقت یہ بہت مختصر ہوتی ہے اور بعض وقت بہت طویل۔ یعنی کبھی دو تین صفحے کی اور کبھی اس کی طوالت ہزار صفحے تک پہنچ جاتی ہے کبھی قصہ کہانی ہوتی ہے اور کبھی اخلاقی یا مذہبی نظم۔ ہندوستانی شاعر نے اس میں لطیف و شدید اسنجیدہ وغیرہ اسنجیدہ ہر قسم کے مضامین لکھے ہیں۔

ان کے علاوہ مثلث، مربع، محس، مدس، مسبع، مثنیٰ اور معشر ہیں۔ جن میں ہر ترتیب تین چار پانچ چھ سات آٹھ اور دس مصرعے ہوتے ہیں۔ یہ مرثیے، تمنیت اور مبارک باد یا دوسرے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔

بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے نام اور مضمون میں تفاوت نہیں پایا جاتا مثلاً ساقی نامہ، نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم شراب نوشی کے متعلق ہوگی لیکن بعض اوقات یہ مختلف مضامین پر ہوتا ہے۔ مثلاً حیدر (حید بخش) کا ساقی نامہ جو حضرت علی کی منقبت میں ہے۔

تقریباً یہی حال ہندی شاعری کا ہے۔ نظم کے خاص ناموں کو مضمون سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا مثلاً ”پد“ میں ہر قسم کا مضمون آجاتا ہے اور ”پٹہ“ جو ہولی اور بیاہ شادی دونوں کے گیتوں کے لئے آتا ہے شادی کے گیتوں کا خاص نام بعض اوقات بدھوا ہوتا ہے۔

مسلمان کی شاعری خواہ کیسی ہی مختصر ہو اس میں کچھ ایسا صوفیانہ رنگ ہوتا ہے کہ فوراً پہچانی جاتی ہے۔ فارسی کی طرح کی ہندوستانی کی شاعری میں بھی مرد کے پرے میں عورت کا حسن بیان کیا جاتا ہے اس کے بولاف ہندوستانی کی شاخ ہندی میں عورت اپنا عشق ایک نوجوان کی نسبت ظاہر کرتی ہے اور عشقیہ اشعار اس کی زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اردو میں بھی یہ پایا جاتا ہے اور اس صورت میں اس شاعری کو ریختہ کہتے ہیں۔ انشا اللہ خاں نے اس قسم کی شاعری کو اس صدی کے آغاز میں رواج دیا۔

اردو میں بھی فارسی کی دہی قسیم اور دہی بحر ہیں جو فارسی میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دو قسیم صرف ہندوستانی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک مکرری اور دوسری پسلی، جن کا ذکر میں بعد

میں کروں گا۔

عربی میں اول اول دیوان کا نام نظموں کے ایک معمولی مجموعہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً دیوان فرید اور دیوان امر لقیس لیکن اب عربی نیز مشرق کے مسلمانوں کی دوسری زبانوں جیسے ہندستانی پشتو، فارسی، ترکی میں غزلوں کے ایسے مجموعے کا نام ہے جو بالعموم مضمون قافیہ کے آخری حرف کی رعایت سے حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب ہو۔ علاوہ غزلوں کے اس میں دوسری نظمیں بھی شریک کر دی جاتی ہیں۔ کلیات مصنف کے کئی دیوانوں اور تمام متفرق نظموں کے مجموعے کا نام ہے۔ ہندی شاعری میں یہ دو اصطلاحیں متعل نہیں ہیں۔ مثلاً دوہروں، کبتوں اور شلوکوں کے مجموعے کو (جو دیوانگری میں لکھے جاتے ہیں) کبھی دیوان یا کلیات نہ کہیں گے۔

کلیاتوں یا دیوانوں کے خاص خاص نام بہت کم بلکہ شاذ ہوتے ہیں۔ صرف چند ہی ایسے ہیں جن کے خاص نام ہیں۔ مثلاً اختر (واجد علی شاہ) موجودہ بادشاہ اودھ کے دیوان کا نام فیض بنیان ہے۔ اور جوش (احمد حسن خاں) کا دیوان گلدرستہ سخن کہلاتا ہے۔ رشک کے دو دیوان نظم مبارک اور نظم گوہر (؟) کے نام سے موسوم ہیں اور کلیات پیش کا نام گلزار مضامین ہے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں جو ان مجموعوں میں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر عاشقانہ اور صوفیانہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے مصنف اکثر مسلمان ہوتے ہیں اور وہ حسن جادوانی (باقی) اور حسن مخلوق (فانی) میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جو ہماری نظروں میں خلاف اتقا معلوم ہوتا ہے۔ انھیں خدا، عورت یا مرد کے پھرے میں نظر آتا ہے اور اس لئے بعض اوقات اعلیٰ درجہ کے دو حافی اشعار کے ساتھ ساتھ کم درجہ کا سوتیانہ بلکہ فحش کلام بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ مروجہ یورپین اور مسیحی آداب نے اجازت دی ہے اس نے دیوان دلی کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ نیز میری کتاب ”تاریخ ادب اردو“ اور ”ہندوستانی گیتوں“ میں بھی بہت سی غزلوں کے ترجمے آگئے ہیں۔ ان سے اس قسم کی شاعری کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بعض غزلیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں اور میری رائے میں پندار اور انیک راین کے کلام بلکہ حافظ کی غزلوں کی برابری کرتے ہیں جن کی دنیا میں اس قدر شہرت ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ باقی

کی ترکی غزلوں سے کہیں بہتر ہیں۔

بڑا نقص ان میں یہ ہے کہ چند ہی مضمون ہیں جن کا طرح طرح سے اور اکثر ایک ہی قسم کے الفاظ اور جملوں میں بار بار اعادہ ہوتا ہے اور اس سے جی اکتا جاتا ہے۔
ایسے اشعار بکثرت ہیں جن میں تکلف اور آورد پائی جاتی ہے اور بٹلر کا یہ شعر مشرقی شاعروں پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔

”جو نوگ مقفی اشعار لکھتے ہیں انہیں ایک مصرع کی خاطر دوسرا مصرع بنانا پڑتا ہے“

چند ممتاز اور مقبول دیوانوں کے سوا دوسرے دیوانوں کا پڑھنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔
دوسرا نقص ان غزلوں میں یہ ہے کہ ان میں عموماً ابہام پایا جاتا ہے اور اہل مشرق اُسے حسن سمجھتے ہیں اور اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

ہندوستانی دوویں میں دلی کا دیوان بہت مشہور ہے۔ باوجود اس کے ممالک مغربی و شمالی میں آج کل اسے بہت کم لوگ پڑھتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ دکنی زبان میں ہے بلکہ زیادہ تر وہ یہ ہے کہ اس کا طرز بیان قدیم ہے۔ سودا، میر درد، جرأت اور یقین کے دیوانوں کا یہ حال نہیں یہ اس کو مقابلے میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں۔

ہم عصر شعرا کے دیوانوں میں آتش، ذوق، نوید اور نظیر کے دیوان بہت مشہور ہیں۔
دیوانوں کے آغاز اور خاتمہ پر جو نظمیں ہوتی ہیں وہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے متعلق میں ”ہندوستانی ادب کی تاریخ“ میں ذکر کر چکا ہوں۔

طویل ثنویوں میں یا کسی خاص مضمون کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے یا بعض اوقات پورا قصہ منظم کر دیا جاتا ہے۔ اکثر یا تو قصے کہانیاں ہوتی ہیں یا کم و بیش تاریخی واقعات یا بالکل فرضی اور خیالی قصے۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے طور پر کسی ایسے قصے کو نظم کر دیتا ہے جو پہلے سے مشہور ہے۔ اس قسم کی بہت سی ضخیم نظمیں موجود ہیں اور بعض ان میں سے قابل قدر ہیں۔ بعض شاعروں نے کئی کئی ثنویاں لکھی ہیں اور ہندوستانی فارسی اور ترکی میں ایسے شاعر بھی ہیں جنہوں نے پانچ بیلیج اور سات

سات مثنویاں لکھی ہیں۔ چنانچہ بعض مثنویوں کے مجموعے خمسے اور ہفتے کہلاتے ہیں، گویا وہ مثنویوں کے دیوان ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور نظامی اور امیر خسرو کے خمسے اور جامی کا ہفتہ ہے جو استعارۂ ہفت اور نگ بھی کہلاتا ہے۔

بعض قصے ایسے مقبول ہوئے ہیں کہ انھیں اکثر شاعر دی نے نظم کیا ہے اور مثنویوں کے مجموعوں میں وہ ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر مشہور مشرق کے عاشقوں کے قصے ہیں مثلاً یوسف زلیخا، فرہاد و شیریں، مجنوں لیلیٰ اور واقع و عذرا۔

بعض بہادر اور نامور لوگوں کے قصے بھی ہیں جو بہت مبالغہ آمیز ہیں مثلاً سکندر، رستم، حمزہ، حاتم طائی، بہرام گور (یہ نام اس کا اس لئے پڑ گیا تھا کہ اسے گور کے شکار کا بہت شوق تھا) ہندوستانی میں یہ اسلامی قصے خوب خوب بیان ہوئے ہیں اور ان میں مقامی رنگ بھی آگیا ہے جس سے اور لطیف پیدا ہو گیا ہے۔

اکثر مصنفین نے اپنی نظموں میں یہ بیان کیا ہے کہ یہ فارسی کے ترجمے ہیں۔ یہ بھی ایک طریقہ بیان ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان فارسی تصانیف پر مبنی ہیں جنھیں مشرق میں خاص شہرت حاصل ہے۔ اس سے قبل ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستانی کے رواج سے پہلے ہندوستان کے مسلمان اور بعد میں ہندو بھی ایک زمانہ دراز تک فارسی لکھتے پڑھتے تھے۔ باوجود رواج کے ہندوستانی میں لکھتے وقت مصنفین بہت پس و پیش کرتے تھے اور اس معمولی زبان کے استعمال کے متعلق بہت سے عذر کرتے تھے اور یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی نئی تالیفات کا تعلق فارسی تصانیف سے قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے جب ان ترجموں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکثر وہ ترجمہ تو کیا اصل کی نقل بھی نہیں ہیں بلکہ اسی مضمون پر جداگانہ کتابیں ہیں اور ظاہری ترتیب اور بنیادی امور میں دونوں اہل سہ مختلف ہیں علاوہ شاعری کے دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے مثلاً آرائش محفل جو بھان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ خیال کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ اور انکساری (مقامات کا تذکرہ) ہے اور محفل فارسی کتاب کا ترجمہ یا خلاصہ نہیں ہے۔

میں نے ”یوسف زلیخا“ کے چھ مختلف نسخے دیکھے ہیں۔ ایک امین کا جو سنہ ۱۱۰۲ء میں لکھا گیا، دوسرا تپش کا جو مصنف نے قید خانے میں تصنیف کیا۔ تیسرا فردوسی لاہوری کا جس پر اس کے حریف اور ہم عصر شاعر میر فتح علی نے بہت کچھ نکتہ چینی کی ہے اور ”قصہ یوم و یقال“ لکھ کر فردوسی کے باپ کے پیشے پر طعن کیا ہے۔ چوتھا عجیب کا جو زمانہ حال کا شاعر ہے۔ پانچواں (ممدی علی) عاشق کا جو ختمہ کا ایک حصہ ہے۔ اور چھٹا نسخہ بمبئی میں سنہ ۱۱۸۰ء میں ”عشق نامہ“ کے نام سے طبع ہوا۔

ہندوستانی میں ”یلی امجون“ کے پانچ نسخوں کا مجھے علم ہے ایک تاج علی کا، دوسرا اعظم دہلوی کا جو شاہ جیلان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ہوس نے بھی ایک ییلی امجون شاہ نامہ کی بحر میں لکھی ہے یہ آصف الدولہ نواب اودہ کے دوست داروں میں سے تھے اور رقی اور رضا اور رسا کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ چوتھا ولا کی تصنیف ہے جو امیر خسرو کی فارسی تصنیف کے متبع میں ہے۔ پانچواں ایک ترجمہ ہے جن کا ذکر ڈاکٹر سیرنگ نے کیا ہے اور یہ ان سب سے قبل کا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے بہرام گور کے قصے پر ہندوستانی میں تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حیدری کی ہے جس کا نام ”ہفت پیکر“ ہے جو نظامی کی اصل فارسی تصنیف کا نام ہے۔ دوسری تابانی (؟) کی ہے جو گوگندہ کا رہنے والا تھا اس کا سنہ تصنیف ۱۱۰۲ء اور ایک حقیقت بریلوی کی ہے جو سنہ ۱۱۰۲ء میں لکھی گئی، اس کا نام ہشت گلزار ہے۔ بظاہر یہ ہشت بہشت کی مناسبت سے ہے لیکن بجائے اس کے ہفت گلزار نظامی کی ہفت پیکر اور ہاتفی کی ہفت منظر کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا۔ ہاتفی نے یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ بہرام گور شاہ ایران یزد برد کے بیٹے کے سات بیویاں تھیں اور سات مختلف باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں۔

سکندر کے متعلق ہندوستانی میں مجھے دو قصوں کا علم ہے۔ ایک اگرے کے اعظم کا ہے جو اس نے نظامی کے سکندر نامے کے متبع میں لکھا ہے۔ دوسرا نکمت دہلوی کا۔ یہ بھی سکندر نامہ ہی کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔

حاکم طائی کا قصہ ہندوستانی میں بھی ایسا ہی عام ہے جیسا فارسی میں۔ جہاں تک میرا علم ہے یہ قصہ

۵۴۳
ہندوستانی میں حیدری، سراج اور گوبند ناتھ نے لکھا ہے۔

شاہ و درویش کا قصہ ہندوستانی فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی میں (یعنی نرائین) جہاں کا قصہ زیادہ تر مشہور ہے

امیر حمزہ (عم حضرت معلم) کا عجیب و غریب قصہ بھی کئی صاحبوں نے لکھا ہے ان میں سے دو کا مجھے علم ہے ایک تو عاشق کا ترجمہ ہے جس کی تفصیل میں نے کسی دوسری جگہ لکھی ہے۔ دوسرا غالب لکھنوی کا جو کہا جاتا ہے کہ فارسی کا ترجمہ ہے اور کلکتہ میں چھپا ہے۔

ان قصوں میں سے جو مشرق کے مشاہیر کے متعلق لکھے گئے ہیں میں صرف ایک کا اور ذکر کروں گا۔ یعنی ہرگز بن شاہ پور شاہ ایران کا قصہ جو ہرمز و بن شاہ پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے مذہب مانی کو فروغ دیا۔ اہل مشرق مانی کو بہت بڑا مصور اور شعبہ باز خیال کرتے ہیں۔

علاوہ ان قصوں کے جو اسلامی مشرق میں مقبول و معروف ہیں چند ہندی قصے بھی جنہیں ہندوستانی شعرا نے فراموش نہیں کیا۔ مثلاً شکنتلا کا دلفریب قصہ، جو ڈراما کے تیغ میں نہیں لکھا گیا بلکہ مہابھارت کے اہل قصے پر لکھا گیا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ہندی سے کیا ہے (دیکھو ریویو اور نیل بابت ۱۳۵۷ء)

مجھے اس قصے پر ہندوستانی میں چار کتابوں کا علم ہے۔ ایک نواز کا جسے فرخ سیر نے کبیشتر کا خطاب دیا دوسرا کاظم علی جوان کا۔ تیسرا شکنتلا نامک جو کلکتہ میں ۱۳۵۷ء میں شائع ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کے روپن طریقے پر لاطینی حروف میں طبع ہوا۔ چوتھا غلام احمد کا جو ۱۳۵۷ء میں کلکتہ میں چھپا اور جس کا خلاصہ بزنل ایشیاٹک بابت ۱۳۵۷ء میں شائع ہوا اور پانچواں ایک پارسی مصنف (بزن جی دوساجی) کا جس کا ذکر میں دوسری جگہ کر چکا ہوں۔

اسی قسم کے قصوں میں ایک پدمواتی کا قصہ بھی ہے وہ بادشاہ سیاون کی بیٹی تھی اور اس کی شادی چتور کے راجہ رتن سے ہوئی تھی جسے علاء الدین نے ۱۳۵۷ء میں شکست دی تھی۔ ہندوستان کے قصوں میں جاسی نے اس قصے کو نظم میں آب و تاب سے لکھا ہے اور اس قصے میں فاتح کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے پدمواتی ایک ہزار عورتوں کے ساتھ سستی ہو جاتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جنم نے جو ہندی قصے کا مصنف ہے، اسے آگ کے نذر نہیں کیا بلکہ وہ اسلامی فوج کے سردار کو اس طرح دھوکا دیتی ہے

کہ سات پالکیاں ساتھ لے کر جاتی ہے جس میں ٹرے کے مشہور گھوڑے کی طرح، راجپوت سپاہی سوار تھے اور وہ بے خبری میں مسلمانوں پر جا پڑتے ہیں اور انہیں شکست دے کر بھاگ دیتے ہیں۔

دو اور ہندوستانی شاعروں نے بھی جن کا نام عبرت اور عشرت ہے اس بہادر راجپوت رانی کے قصے کو نظم کیا ہے۔

کرشن کا قصہ متعدد ہندوستانی نظموں میں بیان کیا گیا ہے ان سب میں بہتر لالچ کی کتاب ہے جو فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہو گئی ہے۔ اس پر بھوپتی اور کرشن داس اور لال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لال کی کتاب پریم ساگر ہندی ادب میں بہت قابل قدر کتاب ہے۔ اس میں نثر کے ساتھ نظم بھی جا بجا پائی جاتی ہے جس سے کتاب کا لطف بڑھ جاتا ہے۔

رام کے قصے نے دالمیکی کی بدولت صرف سنسکرت ہی میں شہرت حاصل نہیں کی بلکہ ہندی میں بھی متعدد شاعروں نے اس کی داد دی ہے جن میں سے ایک تلسی داس ہے۔ تلسی کی راماین ۱۵۸۰ء سے قبل کی ہے اور اب بھی اہل ہند میں غالباً دالمیکی سے زیادہ مقبول ہے۔ کیشو داس نے اس قصے کو راجنیکا کے نام سے کہا ہے۔ یہ گویا دوسری راماین ہے۔ جس کی شرح جھگن لال نے لکھی ہے۔ سور چند اور دوسرے بہت سے ہندی شاعروں نے بھی اپنا زور قلم دکھایا ہے یہ قصہ گوریسیو کی تصنیف اور ایم فوشے کے ترجمہ کی بدولت یورپ بھی پہنچ گیا ہے۔

اگرچہ ان تمام قصوں کی بنیاد تاریخ ہے تاہم تخیل کی گلکاری سے خالی نہیں۔ اب ہم ان فسانوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالکل خیالی ہیں۔ ان میں ایک کامروپ کا قصہ ہے مختلف ہندوستانی مصنفوں نے اسے نظم اور نثر دونوں میں لکھا ہے۔ نظم میں تحسین الدین، ضیغم، آرزو، حسن، سراج نے طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں کندن لال نے اس قصے کو لکھا ہے جس کا نام ”دستور بہت“ یا ”بہت“ ہے اور یہ ایک فارسی شاعر کی طرف اشارہ ہے جس کی تنقید مصنف نے کی ہے۔ کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ اسی سے لیا گیا ہے جو العین لیلہ میں داخل ہو گیا نیز سینٹ برنڈین کے قصے کی اصل بنیاد بھی یہی ہے جو میک آف فرانس نے لکھا ہے۔ ہندوستانی کے مشہور خیالی فسانے یہ ہیں۔ نل و دیمینتی (نل و دین) جو یورپ میں زیادہ تر مباحثہ

کے نموس کے نام سے مشہور ہے، اس قصے کو بہت سے ہندوستانی شاعروں نے لکھا ہے۔ لیکن سب میں مشہور ہندی کے نامور شاعر سور داس کی نظم ہے۔ اس کے بعد بنگال کے میر علی کی تصنیف ہی جو بہار شش کے نام سے موسوم ہے۔ حال میں لکھنؤ میں اسی قصے کو احمد علی نے بھی لکھا ہے۔

گل بکاولی ایک پر لطف قصہ ہے اس میں ہندی تعلیم کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی ملی پائی جاتی ہے یہ بات ہندوستان میں عام ہے اور جدید ہندوستانی ادب کی نئی خصوصیت ہے۔ اس قصے کا تذکرہ میں نے نہال چند کی کتاب سے جس میں نظم و نثر دونوں پائی جاتی ہیں۔ برنل ایشیاٹک بابت مستنداء میں کیا ہے۔ اسی کو نسیم نے نظم میں لکھا ہے جو اگرہ کالج میں پروفیسر تھا۔ یہ شنوی گلزار نسیم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور شاعر نے اسی قصے کو نظم کیا ہے اور اس کا تاریخی نام ”تحفہ مجلس سلاطین“ رکھا ہے اس سے ۱۳۵۸ھ (۱۹۳۸ء) نکلتا ہے۔ ریکان نے بھی ایک ثنوی ”خیابانِ ریکان“ کے نام سے لکھی ہے یہ نظم دوسروں کی نسبت زیادہ مشہور ہے۔ یہ چالیس ابواب میں ہے اور ہر باب کا نام اس نے ”گلگشت“ رکھا ہے۔ ڈاکٹر پیرنگر کو لکھنؤ کے توپخانے میں اس قصے کا ایک قلمی نسخہ ملا جو دکنی زبان میں تھا اور ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۶ء) میں تصنیف ہوا تھا۔

ہمیر اور رانجھا۔ یہ پنجابی قصہ ہے جسے میں نے ایک نشر کی کتاب سے ترجمہ کیا۔ اس میں جگمگ جگمہ اردو فارسی اشعار بھی ہیں مصنف اس کا مقبول ہے یہ حال کا شاعر ہے۔ اسی نام کا ایک دوسرا شاعر بھی ہوا ہے لہذا دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔

سی پتوں۔ یہ قصہ بھی ہمیر رانجھے سے ملتا جلتا ہے اسے بھی مقبول نے نشر میں لکھا ہے اور محبت نے اسے نظم کیا ہے اور ہندو مصنفین اندر حیات منشی اور انت پرکاش وغیرہ نے فارسی میں لکھا ہے۔ پھولین اور اس کے عاشق تیلہ شاہ کا قصہ۔ اسے کئی دکنی شاعروں نے نظم کیا ہے۔ محمد ابراہیم تیرم دکنی انوار سہیلی کے قول کے بموجب غوری کی نظم بہت مشہور ہے۔

گل و صنوبر۔ مجھے اس قصے کے چھ نسخوں کا علم ہے ایک احمد علی کا جو خمسہ کا حصہ ہے۔ دوسرے چند کھتری کا۔ تیسرا ”گلشن ہند“ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اور کتابوں کا بھی ہے۔ چوتھا دکنی زبان میں جبر کا

ایک نسخہ نظام کے کتب خانے میں ہے۔ پانچواں جو لکھنؤ میں ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا۔ چھٹا جو کلکتہ میں ۱۸۸۷ء میں چھپا اور جسے مولف نے فارسی کا ترجمہ بتایا ہے۔

چار درویشوں کا قصہ۔ یہ قصہ آسن نے لکھا ہے جس کا نام ”بلغ و بہار“ ہے۔ یہ تاریخی نام ہے یہ کتاب ایٹ انڈیا کے ملکی اور فوجی عمدہ داروں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس پر دوسرے ہندوستانی مصنفین نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے ایک عطاحین تحسین ہے۔ اس کتاب کا نام نوظرزمع ہے۔ گرو پرمارتھم کا قصہ۔ تامل میں مشہور قصہ ہے۔ لیکن ہندوستانی میں لکھا گیا ہے اور ۱۸۸۷ء میں

دراں میں طبع ہوا ہے۔
میتال پچسپی اور سنگھاسن تپسی۔ مشہور قصے ہیں اور کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں۔ دھرم نراین لالو، سورت اور کئی ہندی مصنفوں نے ان قصوں کو لکھا ہے۔

محض یاد دہانی کے طور پر طوطا کمانی کا ذکر کرتا ہوں۔ اصل قصہ سنکرت میں ہے۔ اس کے آٹھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں اور اسی قدر ہندی اردو اور دکنی میں ہیں۔ میں صرف نام گنوا دیتا ہوں۔ خاور شاہ، لعل و گوہر، جذب عشق جس کا میں نے خلاصہ ترجمہ کیا ہے۔ نیز ہر ماہ اور ماہ منور جس کا متن میں نے شائع کیا ہے۔

شاعری

(از جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب - بی۔ اے)

The poets eye in a fine frenzy rolling گوی کی نفیس آنکھ در فتنہ سی گومتی
Doth glance from Heaven to earth from نظر ڈالتی ہے زمین پر کبھی آسمان پر
earth to Heaven,
And as imagination bodies forth تو جوں جوں تخیل میں ڈھلتے ہیں انجانی
The forms of things unknown, the poets pen اشیا کے پیکر۔ گوی کا قلم اُن کی نگینیں
Turns them to shapes and gives to airy nothings بنا کر مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی
A local habitation and ہستیوں کا مقام ایک بسنے بسانے
a name. کو ایک نام۔

Shakespeare:

Midsummer Night's Dream.

انسان کی یوں بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو سخن گو ہیں دوسری وہ جو سخن فہم ہیں۔ نرسے سخن گو کا ہی وجود ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ پرندوں کی طرح شعر الاپتا رہتا لیکن کوئی سننے اور سمجھنے والا نہ ہوتا تو بیچارہ شاعر اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا اور اس کے شعر پرندوں کے سریلے بولوں کی طرح ہوا کی نذر ہو جاتے، شاعر کے وجود کے ساتھ سخن فہم نوع کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس کا عکس صحیح نہ ہو گا سخن فہم طبقہ کے موجود ہونے کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ شاعر پیدا کر سکے۔ شاعر اپنے وقت پر پیدا ہوتا ہے خواہ سخن فہم نوع اس کے استقبال کے لئے موجود ہو یا نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوع انسان

کی گوناگوں اقوام میں شاعر زیادہ قابل احترام سمجھا گیا ہے۔

جب کسی قوم میں وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ترقی کہا جاتا ہے تو اس قوم کی ادبی دنیا یعنی سخن فہم طبقے میں ایک خاص گروہ پیدا ہونے اور ارتقا پانے لگتا ہے۔ اس گروہ کا پرانا نام سخن سخن اور جدید لقب نقاد ہے۔ اس گروہ کا پیشہ یہ ہوتا ہے کہ شعرا کے کلام کو سخن سخن کی ترازو میں تولے اور تنقید کی کسوٹی پر رکھے۔ اس گروہ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تنقید کیا ہے؟ تو اس میں شک نہیں کہ اس گروہ کے سربراہ آردہ اصحاب بہت کچھ ہول اور قوانین تنقید پر لکھ ماریں گے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ آپ اور میں خاک نہ بنیں۔ ادبیات کی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تنقید پیشہ گروہ اس قدر قلم اور زبان کے زور سے ادبی دنیا پر چھا سا جاتا ہے کہ شاعر بیچارے اس سے اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اُس کی تیوری کے ذریعے بل پر جان ہی نکل جاتی ہے اور اس کی جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ سے جان میں جان آ جاتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بنیئے نے کسان بیچارے کو جنمک بن کر اپنے قابو میں کر رکھا ہے، اسی طرح یہ سخن سخن گروہ شاعروں اور نثر نگاروں کو اپنی چنگل میں لے لیتا ہے۔

نقاد لوگ صرف یہ سمجھتے ہی نہیں بلکہ جوش میں آکر بعض اوقات لکھ بھی جاتے ہیں کہ شاعر ہولناک ہے لیکن سخن سخن ہونا تو ہے کہ چنے چبانا ہے۔ یہ ایک پُر لطف دعویٰ ہے اور بعینہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آیا یہ کہے کہ ماں بنا سہل ہے بچوں کا پالنا پوسنا، بچہ کا کھیل نہیں۔ نقاد بیچارے کو آنا کا رتبہ بھی حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اول تو شاعر طبعاً دودھ پیتے ہی نہیں اور اگر عالم وجود میں آنے سے قبل اُن کی پرورش بطن شاعر میں کسی قسم کی ذہنی غذا سے ہوتی بھی ہے تو وہ اُن شعرا کے کلام سے ہوتی ہے جو اُس شاعر کے پیشرو یا ہم عصر ہوتے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن پھر بھی نقاد کا وجود بالکل بے سنی اور بیکار نہیں۔ نقاد ایک طرح کا ترجمان ہوتا ہے اور شاعر کا خاص طور پر مطالعہ کر کے علامۃ الناس کو شاعر سے روشناس کرتا ہے۔ شاعر کے جواہر پاروں کو کھود کھود کر نکالتا اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ کام بھی اگر اس ہمہ گیر نظر اُن تھک محنت اور مذاق سلیم کے ساتھ کیا جائے جوینٹ پوپ (Sainte Beuve) کی خصوصیات تھیں تو ظاہر ہے کہ ایسے کام سے علامۃ الناس

شاعر کے کلام سے زیادہ سبق اور مسرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اردو کی دنیا سے ادب میں اس ناچیز راقم کا خیال ہے کہ ابھی تنقید کی صمیم چٹک والے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور خدا کرے جب ایسے لوگ پیدا ہوں تو وہ تنقید کی قوت کو اردو ادب کی رکاوٹ میں نہیں بلکہ ترقی میں صرف کریں۔

شاعروں کے پیٹ سے شاعری کا عطیہ لاتا ہے اور اگر شاعر یہ نہ بیان کر سکے کہ شاعری کیا ہے ؟ تو اس کی شاعری میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا ہو سکتی۔ لیکن نقاد نقاد نہیں ہو سکتا جب تک اپنے دماغ میں اس کو واضح نہ کر لے کہ شاعری کیا شے ہے ؟ لیکن یہ سوال کچھ ایسا پر لطف ہے کہ اس پر صرف نقاد اصحاب نے ہی نہیں بلکہ خود شعرا نے بھی بہت کچھ خیال دوڑایا اور بہت کچھ ڈالا، اس مسئلہ پر دہی مثل صادق آتی ہے جتنے منہ اتنی باتیں اور پھر شاعروں اور نقادوں کی باتیں ! اگر ان سب باتوں کو کوئی صاحبِ تنقید مؤلف مختلف زبانوں سے لے کر اکٹھا کر دے تو بلا سبالتو کسی قسم کے حواشی نوٹ مقدمہ دیباچہ اور تمہید کے یہ باتیں کئی جلدوں میں بھی نہ سما سکیں۔

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قطعی جواب تو اسی وقت ہاتھ آئیگا جب یہ مسئلہ حل ہو جائے کہ ”جان کیا ہو؟“ شاعری خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو کچھ ایسی چیز ہے کہ ہمارے سانس کے ساتھ ہے، انسان کا سانس انفرادی زلیت کے لئے بننا ضروری ہے اتنا ہی سماجی زندگی کے لئے انمول ہے اس لئے کہ زبان سانس کا کھیل ہے بغیر زبان کے زندگی ممکن ہے گردہ انسانی زندگی نہیں۔ زبان شاعری ہے۔ یعنی اگر شاعری نہ ہو تو زبان ممکن ہی نہیں۔ جن اصحاب نے لسانیات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زبان شاعری ہے اور ہر زبان کے الفاظ ابتداءً شاعرانہ تخیل کے کرشمے ہیں جن کو مانجھ منجھ کر اور جن سے طرح طرح کے معنی وابستہ کر کے نامعلوم اور بے گنتی شرانے اس قابل کر دیا ہے کہ آج اس زبان کے بولنے والے اُن الفاظ کو روزمرہ زندگی اور ادبی ضرورتوں کے لئے بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں۔

ہر پھر کر دہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کیا ہے ؟ اس پر راقم اپنا خیال آگے چل کر ظاہر کرے گا لیکن فی الحال اگر آپ اس بات کو مان لیں کہ شاعری کی جان تشبیہ ہے تو پھر اس کا مان لینا کہ شاعری کے بغیر لے لفظ ہو باب دوم ”زبان شاعری“ *Words and their ways in English Speech* ”اگر زبان بیکٹاج (کیلین)“

زبان سحر سے ممکن ہی نہیں کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ وحشی سے وحشی لوگوں کی بول چال میں بھی تشبیہ کا ہونا ہی طرح لازمی ہے جس طرح عشق و محبت کا ان وحشی دلوں میں گھر کرنا ناگزیر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وحشی قبائل میں تیر اور غالب کی سی منجھی منجھائی چچی تلی تشبیہ اور نوزہاں اور جہانگیر کی سی الفت کا لطیف اور شایستہ افسانہ نہ ہو۔

لیکن پھر سوال وہ کا وہی رہا کہ شاعری کیا ہے؟ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا جواب ادولیا جواب جس پر سب آتا صدقاً کہ اٹھیں کوئی نہیں۔ البتہ شاعری کے متعلق میراج اپنا خیال ہے، اوتو قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا ہے۔ یہ بہت آسان تھا کہ بڑے بڑے لوگوں نے اسطو سے لے کر لفکا دیوہرن (*Lafcaadio Hearn*) تک اور ابن رشتیق سے لے کر مولانا حالی تک شاعری کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو نہایت اطمینان اور فرسے کے ساتھ دہرا دیا جائے، اس طرح ایک طرف تو مضمون پھیلتا جاتا اور دوسری طرف یہ سہولت ہوتی کہ میری انگلیاں تو دھمکتی ہیں لیکن دماغ آرام میں رہتا اس لئے کہ میں دوسروں کا سوچنا لکھنا جانتا۔ مگر میں نہ اپنی انگلیاں زیادہ دکھانی چاہتا ہوں نہ دماغ۔ میں شاعری کی بے گنتی تعریفوں میں سے صرف ایک کو یہاں دہراؤں گا یہ تعریف مسٹر ای براڈلی (*A.C. Bradley*) نے اختیار کی ہے اور وہ اُس نورد کی جامعہ میں شاعری کے پروفیسر ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ تعریف پروفیسر صاحب کی طبع زاد ہے۔ پروفیسر بہت کم طبع زاد باتیں لکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ ان کے قلم یا زبان سے جو کچھ جان بوجھ کر یا انجانی سے نکل پڑتا ہے اس کا حوالہ کسی نہ کسی کتاب میں ضرور ہوتا ہے وسیع مطالعہ والے حضرات کچھ ہیٹے سے ہو جاتے ہیں اور اسی کو برا تیرا بنا سمجھتے ہیں کہ جو جو اہر پارے ادب میں موجود ہیں ان ہی کو الٹ پھیر کر بیان کر جائیں۔ بہر حال یہ تعریف اگر الفاظ کا خیال نہ کیا جائے تو پروفیسر صاحب کی نہیں بلکہ شکسپیر کی ہے یہ ممکن ہے کہ شکسپیر نے بھی کہیں سے اڑالی ہو۔ جس طرح وہ اپنے کھیلوں کے ڈیلنج (پلاٹ) بے تکلف اوروں سے لے لیا کرتا تھا۔ مگر اُس کی تحقیق اول تو مشکل اور دوسرے بے ضرورت البتہ شکسپیر کے متعلق اتنا خیال رہے کہ وہ نہ تو وسیع مطالعہ کا انسان تھا۔ پونہ سی لاطینی اور برائے نام یونانی جانتا تھا، اور نہ اس کے زمانہ میں برساتی کیڑوں کی طرح کتابیں تھیں اور

نہ لکھنے والے۔

خیر اب شاعری کی اس تعریف کو ملاحظہ فرمائیے۔ شکسپیر کے سندر الفاظ کا بھڑا ترجمہ اس مضمون کی پیشانی پر دیدیا گیا ہے۔ مسٹر براڈلی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:-

”شاعری تخلیقی پیکردل کا پیدا کرنا ہے“ *“Poetry is the creation of imagery.”*

اتنی دیر تک اس تعریف کا انتظار قارئین کرام نے جن امیدوں کے ساتھ کیا ہوگا اس کے بعد یہ تعریف مجھول بالمجھول سے ضرور مایوسی ہوئی چاہئے۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ انسان کی تعریفات مجھول سی ہی ہو ا کرتی ہیں یہ عجیب لطیفہ ہے کہ جو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں اور اس عالم پر اسرار کی پہلیاں۔ بوجھنی بہت ضروری ہیں وہیں انسان کی منطق جواب دے دیتی ہے وہیں انسان ابھی ابھی سی باتیں بنانے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا نفس بھی کو کھوکھیل ہے آنکھوں پر اندھیری پڑی ہوئی ہے اور ایک دائرہ میں چکر کھاتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے چکر کھانے کو اندھیری کی وجہ سے آگے بڑھنا تصور کر لے۔

غرض اس شاعری کی تعریف کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخیل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ قارئین کرام کو نفسیات کی مجھول بھلیاں میں ڈال دیا جائے اور پھر اگر آپ کہیں یہ پوچھ بیٹھیں کہ نفس کیا ہے تو پھر اس مضمون کا خدا ہی حافظ ہے۔ نفس کے سمجھانے کو ضخیم جلدیں دیکار ہیں اور پھر بھی یہ ناپسند تو کوئی چیز نہیں۔ بڑے بڑے دماغ بھی نہیں سمجھا سکتے تو اب یہ مضمون اسی طرح آگے چل سکتا ہے کہ آپ تخیل اور نفس کی تعریف اور توضیح کے طالب نہ ہوں۔

تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے۔ پیدا ہونے کی بہترین مثال افزائش نسل ہے۔ نر اور ناری دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر مل کھاتے ہیں اور اس میل کا نتیجہ ہوتا ہے وہ ایک تیسری چیز بنتی ہوئی ہے یعنی یہ کتنا بجا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصہ ہے دونوں کے حصے کیا لمبا طو مادہ اور کیا لمبا طو نفس مل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم

ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کی جاسکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستثنیٰ ہوتی ہیں۔ ایک مثال لے لیجئے۔ مولانا نذیر احمد نے 'اصغری' کو ادبی ہستی دی ہے۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جس نے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے جو اصغری پیدا کی ہے وہ اُس طرح نہیں پیدا کی جس طرح اُن کی اولاد پیدا ہوئی یعنی مولانا کے دماغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہو گیا ہو گا کہ افزائش نسل کے لئے نژاد ناری کا کچا ہونا اُل ہے۔ ادبی ہستیوں کے لئے اس قسم کی کجائی ضروری نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے۔ لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ویسی ہی ہوں جو جیتے جاگتے سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی ایک شریف بیوی کی سوانح عمری ہے جو کسی زمانہ میں گزر چکی ہے اس مادی دنیا میں سانس لے چکی ہے۔ اُس کی بات چیت اس کی چال ڈھال اس کے طور طریقے اس طرح بیان کئے گئے ہیں، اُن میں اس طرح جان بھونکی گئی ہے کہ اُن کو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہو اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اس کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔

اگر آپ اس تقسیم سے اکتانہ گئے ہوں تو میری خاطر اس پہلو سے بھی غور فرمائیے کہ ہم اپنے ہم جنسوں کو دورانِ زندگی میں دیکھتے بھالتے ہیں۔ اُن میں اپنے گھر والے رشتہ نامتے والے دوست احباب ملنے جلنے والے بھی ہوتے ہیں جن سے ہمیں زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے سرسری شناسائی یا عارضی روشناسی ہو جاتی ہے یہ جتنی صورتیں ہم دیکھتے ہیں۔ اُن میں سے بعض واضح اور گہری۔ بعض موہوم اور سطحی ہمارے تخیل کے صفحات پر مرتسم ہو جاتی ہیں موہوم سی صورتیں اگر چمکے وہ گوشت پوست والے چلتے پھرتے انسانوں کی سی کیوں نہ ہوں، بسا اوقات ہمارے تخیل کے صفحہ پر سے اڑ جاتی ہیں۔ اب اس قوت کو ملاحظہ کیجئے کہ کسی شخص کا سرے سے گوشت پوست والا وجود ہی نہیں مگر ایک خلاق دماغ اپنے تخیل کے جادو سے اس کی تصویر کھینچتا ہے اور اصغری بالکل ایسی معلوم دیتی ہے کہ گویا کسی اپنے رشتہ کی دیکھی بھالی ہوئی کا نقشہ سلنے

رکھتا ہے۔

اس بیان سے تخیل کی دو صورتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے ایک اصلی انسان کو دکھایا اور اس طرح کافی غور سے دیکھا کہ جب اس کی صورت بھی سامنے نہ ہو وہ موجود بھی نہ ہو تو اس وقت بھی آپ کا تخیل دماغ میں اس کی صورت پر تکرر کرتا ہے تخیل کی دوسری صورت یہ ہے کہ مولانا ذرا احمد نے ایک فرضی عورت کو تخیلی پیکر دیا اور اس طرح دیا کہ ان کے الفاظ نے آپ کے تخیل کے پردہ پر بھی بن گوشت پوست والی ہستی کے باوجود بھی ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسی اپنے کسی خاص عزیز قریب یا مخلص دوست کی جس سے آپ بے تکلف ملتے جلتے ہوں جس کے دل کی باتیں آپ پر روشن ہوں جس کے رجحان اور جذبات سے آپ بخوبی واقف ہوں اور آپ کے دماغ پر سے یہ تصویر ایک دفعہ کھینچنے کے بعد پھر کبھی مٹ نہیں ہو سکتی۔

اُردو ابیات کے میدان نظم میں ایسا کیر کڑ جو اصغری کی طرح جیتا جاگتا ہو مجھے نہیں ملا۔ اُردو میں ڈراما (نائب) کے رواج نہ پانے سے نظم میں کسی شخص کے خیالی پیکر کے پیدا کرنے کا ایک زبردست شعبہ گویا مفقود ہی رہا۔ دوسرے یہ تم ہو کہ ہمارے شعرا کو پریشاں گوئی اور ریزہ خیالی کی کچھ ایسی ہلکت سی پڑ گئی کہ مسلسل نظم کا لکھنا نہ صرف وہ بھر ہی ہو گیا بلکہ انے ہوئے استادان فن کے بھی قابو کی بات نہ رہی۔ یہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری کی جان تخیلی پیکر وں کا پیدا کرنا ہے اور اسی لئے ہر شاعر میں جو دراصل شاعر ہو خواہ وہ ردیف و قوافی کی زنجیروں میں بند ہو۔ بھانت بھانت کی پر ذیسی بحر وں میں جکڑا ہو خواہ غزل کے خواب پریشاں مبتلا ہو اور غیر مسلسل تک بندی کی بھول بھلیاں میں قید ہو تخیلی پیکر پیدا کر ہی لیتا ہے۔ اس قسم کے تخیلی پیکر مصوّر کی تصویر کے مثل ہوتے ہیں اُن میں پوری طرح جان نہیں پڑتی۔ اس کی بہترین مثال ناچیز راقم کی رائے میں میر حسن والی ذیل کی تصویر ہے میر حسن واقعی شاعر تھے اور ان کی اس تصویر میں نرمی ایک چوکھٹے والی بے جان سی تصویر ہی نہیں پائیے بلکہ اس میں چلت پھرت آپ کو ملے گی اور اس طرح ایک حد تک کچھ جان سی پڑی ہوئی نظر آئیگی اُردو کے مشہور و معروف سراپا بھی اس تصویر کے سامنے بے جان سے ہیں ان تمام سراپاؤں کے

پڑھنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں موبوم سی دیکھی ہوئی صورت کا خاکہ کھینچا جا رہا ہے۔ لیکن ٹھانسا
 بھانک سا جیسے ہمارے بعض اُردو اخباروں میں تصاویر دی جاتی ہیں۔ بہر حال میرسن نے مینظیر اور
 بدر منیر کا آئنا سامنا کرادیا ہے اور

”گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر“

”ستارہ سی وہ دلربا“ غم انسا گلاب پھر کتنی ہے دونوں ہوش میں آتے ہیں۔ شہزادہ تو
 وہیں رہ گیا نقشِ بیا سا بھچک۔

لیکن بدر منیر دہاں سے لجا کر اٹھلاتی ہوئی بارہ دری کی طرف بھاگتی ہے۔ اور میرسن فرماتے ہیں۔

کہ وہ نازنین بھی جھجک منہ چھپا کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
 چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر
 وہ گدہ سی وہ شانے وہ پشت و کمر وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر

وہ گنگھی وہ چوٹی کھنچی صاف مہمان کنارِ سی کا پیچھے چمکتا موبان
 کموں اس کی چوٹی کا کیا رنگ ہنگ کہ جوں آخری شب ہو جھکے کارنگ
 نمایاں ہو یوں اور صنی سے جھلک کہ جو ابر میں برق کی ہو چمک

وہ پیٹھ اس کی ثغافِ آمیز ساں تس اور پر وہ چوٹی کا پڑ ناداں
 کہ جوں ہوئے دریا پہ کالی گھٹا

جن الفاظ سے تصویر کھینچی ہے وہ یہ ہیں۔

”کمر اور چوٹی کا عالم دکھا“

اور اس مصرع کی بھی جان ”عالم ہے“۔ ”وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر“ یہ تصویر کو اور واضح کرتے ہیں
 اور ”کناری کا پیچھے چمکتا موبان“ تصویر کو روشن کرتا ہے، اور صنی میں سے جھلک اور برق کی ابر

میں سے چمکنے کی تشبیہ نے تصویر کو مکمل کر دیا اور اس میں سرعت پیدا کر دی۔ بدرنیر کے دوزخ ل جانے پر پیٹھ کی شفاف سطح پر چوٹی کا لہرنا سمندر پر دو کالے بادلوں کی ایک پٹی کا بچکولے کھانا ایک دل فریب تشبیہ ہے اور اس سے یہ تصویر دلکش ہو جاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ تخیلی پیکر کسی انسان کا کیرکٹریا انسان کی مصوری والی تصویر ہی ہو، صبح شام کے سورج کی روشنی کے رنگ برنگی قوس قزحی نظارے، پہاڑوں کے آثار چڑھاؤ، ابھار اور دھلاؤ سمندر کا سانس لینا، سیہ موجوں کا پہاڑوں کی طرح ابھرنے، بادلوں کی طرح پھیلنا، ندیوں کا سانپ کی طرح لہرنا، جھیلوں کا آنکھیں پھاڑ کے ستاروں کا ٹکنا، زمین کا نشیب و فراز درختوں کے جھنڈ گھاس کا املہانا، موسموں کی بہاریں، غرض فطرت کا ہر منظر سہاؤ یا ڈرانا، سماج کا مد و جزر، انسانی تعلقات کی سچیدگیاں، اقتصادِ بلندیاں اور پستیاں، سیاسی سکون اور تلاطم، صداقت پر قربانیاں، گندم ناجو فروشاں، نفس کی کیفیتیں، جذبات کا جوار بھاٹا، خواہشات نفسانی کا تیرتاگ مکمل، غرض فطرت انسانی کا انفرادی اور اجتماعی ہر رنگ شاعر کی مصوری کے لئے ایک زبردست موضوع ہے۔ فطرت کے بے گنتی روپ انسان اور سماج کے بے شمار سوانگ ان سب کی تصویر کھج سکتی ہے، ان کو تخیلی پیکر دیا جاسکتا ہے۔

پانی سورج کی تراز سے بخار بن جاتا ہے اور قدرت کا یہ عمل ہر جگہ جاری ہے، سمندر کے سینہ پر زمین کے مسامات میں درختوں کے پتوں پر جنگل کی جھیلوں اور ندیوں میں۔ ہر جگہ پانی صورت بدلتا رہتا ہے اور پھر کرہ ہوا کے بلند اور سرد طبقوں میں، بادل کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرت کا روزانہ کرشمہ ہے، شے 'لی' (shell) نے 'بادل' کے نام سے ایک لی ریک نظم لکھی۔ یہ نظم لطافت، سریلے پن اور تخیلی پیکروں کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں دیتی اس کے آخری بند کے پہلے چار مصرعوں کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ شاعر کے اعلیٰ پایہ کے کلام کا ترجمہ دوسری زبان میں ایک کٹھن کام ہے۔ یہ ترجمہ محض اس موقع کے لئے اندازِ نظرین ہے۔ اتنا دفع رہے کہ اس نظم میں بادل زبانِ حال سے گویا ہے۔

ہاں ہاں میں ہوں لاڈلا بیٹا سند پرتھی اور پانی کا
I am daughter of Earth and Water

امبر نے جگمگ دیں پالا
And the nursing of the sky

میں گزرتا ہوں مساموں میں وصال کے اور تپنے کے
I pass through the pours of the Ocean and sky

روپ بدلتا پر نہیں مڑتا
I change but I cannot die

میں جب ان مصرعوں کو پڑھتا ہوں۔ شے لی کے مصرعوں نہ کہ اس ناکافی ترجمہ کو۔ تو میرے تخیل کی سیر بین کے سامنے ایک دھواں دار منظر کھل پڑتا ہے۔ بھاپ کا ہر طرف سے کسی کے کھلے بالوں کی طرح لہرا لہرا کے اٹھتا، ہوا کی اونچائیوں میں بادل بن کر پھولنا اور پھلنا۔ طرح طرح کی شکلیں بنانا ہاتھیوں کی طرح جھومنا، ردی کے گالوں کی طرح پھٹنا اور ہوا میں بننا، کہیں سورج کی کرنوں کو جگر مگر کرنا، کسی طرف رات کی سی سیاہی لے کر ڈرانا سا بننا اور پھر مینہ کی دھاریں اور دہی پانی کا پانی۔ یہ ہے تخیلی پیکر جو میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ آخر کا مصرع جس کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے۔ ”روپ بدلتا پر نہیں مڑتا“ میری اس سب سے گہری خواہش کو کہ میں غیر فانی ہوں، عجیب موہوم اور لطیف پیرایہ سے ایک ٹوکا سادے دیتا ہے۔

اردو شاعری میں ایسے مسل اشعار جو تصویر کی تصویر ہوں اور حیات انسانی کا چہرہ بھی ہوں، تلاش کرنے سے ضرور مل جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کے عام رنگ کا زہر یا اثر اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ جو شعرا طبعاً اس رنگ کی نظمیں لکھ سکتے تھے ان کو بھی غزل گوئی اور حیات اصلی سے آنکھیں بند کر لینے سے پیشتر محض قافیہ بچا بنا دیا، جہاں تک اردو شاعری پر نظر دوڑائی جاتی ہے، تو ایسی نظمیں یا اشعار جن میں تخیلی پیکر کے ساتھ اصلیت بھی ہو بڑی شکل سے ہاتھ آتے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی البتہ ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں اس قسم کی نظمیں اور اشعار نسبتاً بہت زیادہ ملتے ہیں مگر یہی وہ شاعر ہے جس کو ہمارے سنخوروں اور سنخنوں نے نام دھردھصر کے اس قدر نگو بنا دیا کہ دنیا کے اردو کی مہذب محفلوں سے تقریباً نظیر کے کلام کو خارج کر دیا گیا ہے۔ لیکن نظیر کو عام حقہ نے سر آنکھوں پہ لیا اور اس کی نظمیں فقیروں کی زبان سے ہندوستان

کے دور دور گوشوں میں محلوں کی ڈیوڑھیوں غریبوں کی جھوٹریوں بازاروں اور گلیوں میں گونجتی رہیں۔ یہ تاثیر کے جادو سے بھرا ہوا مصرع کس نے نہیں سنا۔

”سب ٹاٹھ پڑا رہ جادوے کا جب لاد چلے گا بنجارا“

یہ اردو کی انٹ چیزوں میں سے ہے اور تخیلی پیکر اس قدر جیتا جاگتا اور الفاظ ایسے موزوں اور برجستہ ہیں کہ اردو میں یہ مصرع ایک ضرب المثل سی ہو گیا ہے اور ایک دفعہ کان میں پڑنے کے بعد ممکن نہیں کہ پھر حافظہ سے نکل جائے۔ اس نظم کا ایک بند یہ ہے۔

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ قینا ڈیرا ڈانڈا ہے زرد ام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپرا کھانڈا ہے
جب نامک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں آتا ہے پھر اٹانڈا ہے نا بھانڈا ہے نا حلو ہے نا مانڈا ہے
سب ٹاٹھ پڑا رہ جادوے کا جب لاد چلے گا بنجارا

اب ریل نے وہ پرانے بنارے کے ٹاٹھ بھی پڑے رہنے دے اور اس لئے قارئین کرام کو بغیر خاص مطالعہ اور تخیل پر زور دے اس بند کا تخیلی پیکر مستحضر نہ ہو سکے گا لیکن شمالی ہند کے جاڑے کی تصویر دیکھئے۔

جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی اور منس منس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی
دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی پالاہی برف گچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی
چلا خنم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی

دل ٹھوکر مار بچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہوشی سی تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو جی ہو سب کی تیشی سی
ہو شور پسو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی کلے پر کلا لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاٹے کی

ہر ایک مکاں میں سردی نے آ بازہ دیا ہو چکر جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑا کر او تھر تھر

۱۷ بیٹھی ہو مودی رگ رگ میں اور برف پگھلا ہو پتھر مجھ باندھ مہا دھڑ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لیکر
سنائا باد کا چلح ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس تصویر کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ تصویر صاف اور چلتی پھرتی ہے۔ البتہ ”ہنس ہنس“ پس منہ بھلتا ہو اور ”دن جلدی جلدی چلتا ہو“ کس قدر جان ڈالنے والے اور روشن رنگ بھرنے والے اور اہمیت میں ڈوبے الفاظ ہیں۔

ہر اچھے اور اعلیٰ ترین کلام میں تخیلی پیکر کا ہونا لازمی ہے۔ خواہ وہ کلام ایک مصرع یا بیت کی صورت میں ہو خواہ ایک مستقل نظم ہو جس میں بہت سے مصرعے اور طرح طرح کی ترکیبوں سے بند بنائے گئے ہوں۔ اردو شاعری میں ایسی ابیات بہت کم ملیں گی جن میں تخیلی پیکر مخفی ہو یہ مخفی ہنی تصویریں سی ہوتی ہیں جن کو کلان میں سے دیکھنے پر مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔
میر کے اس شعر کو لیجئے۔

اٹھی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر کی ذہن بندی سے جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک پلنگ پر ایک شخص دراز ہے سوکھ کر کانٹا چہرہ پر زردی کھنڈی ہوئی البتہ منہ کی راہ سے دم نکلا ہے اور مردنی چھا گئی ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی جو اس بد نصیب مرنے والے کا کوئی بڑا بوڑھا ہے پلنگ کی ٹپا کے پاس کھڑا ہو کر جھک کر اسے دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ وہ بد نصیب ہو چکا اپنی ران پر ماتہ مار کر بول اٹھتا ہے۔

۱۲

دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر میں ”دیکھا“ کا لفظ وہ بجلی کا بٹن ہے جس کو دباتے ہی اس شعر والا تخیلی پیکر دماغ میں تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔

غالب کا شعر ہے

مے سے غرض نشاط سے کس روسیاء کو

اک گونہ بے خودی مجھے دل رات چاہئے

یہ ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ جب انسان اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے میں ناکامیاب ہوتا ہے تو اپنے ماحول سے اس کا دل اٹھ سا جاتا ہے، متواتر ناکامیوں سے اس کا جی ہٹتا ہو جاتا ہے اور جس شخص سے خواہ وہ جان پہچان کا ہو یا شناسا نہ ہو دوست ہو یا مہنپی وہ ملتا ہے اُسے یہی خیال ہوتا ہے کہ سب میری ناکامیوں پر دل میں ہنستے ہیں اور میری غیبت میں میرا تسخر اڑاتے ہیں۔ غرض اس کے دل میں یہ ٹھن جاتی ہے کہ کسی طرح اصلیت سے بھاگ جاؤں۔ اصلیت سے بھاگنا کئی طرح ہو سکتا ہے۔ خود کشی کر لی جائے۔ اپنے مقامی ماحول کو بدل دیا جائے اور کسی اور جگہ سکونت اختیار کر لی جائے یا یہ کہ اپنے خواہ کو نشہ کی ترنگوں میں ڈبو دیا جائے اور اس طرح اصلیت کو فراموش کیا جائے اب غالب کا اوپر والا شعر پڑھئے۔ ایک شخص بہت ذہ حال نہ کپڑوں کا ہوش نہ تن کی خبر زیت سے اکتا ہوا آنکھیں پٹی پٹی جن میں لذت حیات کی چمک کے بجائے وحشت اور دیوانہ پن کی سی جھلک ہو پہلو بدلتا بے چین سا بیٹھا ہوا ہے۔ ایک دوست ایک نصیحت کرتا ہے کہ شراب نہ پینی چاہئے اور جیسی نصیحت کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے ایک لمبا چڑا وعظ کرتا ہے اور عامیانا استدلال پیش کرتا ہے کہ لہو و لعب اور عیش رانی کو خدا اور رسول نے منع فرمایا ہے وغیرہ وغیرہ جس شخص کو اس طرح نصیحت کی جا رہی ہے وہ کوئی عامیانا شخص نہیں ہے۔ اس کی نظر نفس کی گہرائیوں پر پڑتی ہے۔ اکتا دینے والے اور وہ بھی مولویانہ وضع کے نامح کی بڑ کو سنتے سنتے آخر بے تاب ہو کر وہ بیچارہ چمچ اٹھتا ہے کہ میں اُسے تعلیم کرتا ہوں کہ مے نوشی بُری چیز ہے روسیاء ہی کا باعث ہے۔ لیکن میری مے نوشی لب و لعب کے خیال سے نہیں ہے۔ میں اس دنیا کے آلام و مصائب نا انصافیوں اور ناکامیوں یا ایک لفظ میں اس دردناک اصلیت سے بیزار ہوں میں اس سے بھاگنا چاہتا ہوں اور اس کی یہ صورت ہے کہ شراب پی کر اس اصلیت اور اپنے آپ کو

بھلا دینا چاہتا ہوں اور یہ ایسے وقت ہو سکتا ہے کہ مجھ پر دن رات نشہ کا اتنا کیف ضرور رہے کہ اصلیت سے اور خود سے بے خبر مار ہوں۔ میں معمولی شہریوں کی طرح بدست اور بد ہوش نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہتا ہوں۔

اب زیادہ مثالوں کی نہ تو ضرورت اور نہ اس مضمون میں گنجائش۔ قارئین کرام ہر شاعر کے مطالعہ کے دوران میں ایسی مثالیں پاتے جائیں گے۔ اتنا البتہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ ہر شعر والا تخیلی پیکر ہر شخص کے لئے من و عن یکساں نہیں ہو سکتا اور ہر کی مثالوں میں جو تخیلی پیکر پیش کئے گئے ہیں وہ وہ ہیں جو اس ناچیز راقم کے تخیل کے پردے پر ان اشعار کے مطالعہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ بڑی چیز یہ ہے کہ شعر سے تخیلی پیکر پیدا ہو۔ ہر مطالعہ کرنے والے کے تخیل پر جو تصویر کھچے گی وہ جداگانہ ہوگی اور ہونی چاہئے۔

شاعر کے پاس وہ جادو کی چھڑی جس کے چھوتے ہی ”کچھ نہیں“ سے تصویروں کا مرقع نکل پڑتا ہے تشبیہ ہے۔ شاعر کے ذہن میں جہاں پھر کئی ہوئی تشبیہ آئی اور تخیلی پیکر ڈھلنے لگے۔ تیر بہدف تشبیہ کا انتخاب شاعر کی نظر پر منحصر ہے۔ کوئی نہیں سکھا سکتا کہ شاعر کس طرح موزوں تشبیہ تلاش کرے اور پنہنے۔ یہ نظریات کے پیٹ سے ملتی ہے۔ ”تشبیہ“ کے ذہن میں ابھر آنے کے بعد دوسرا مرحلہ شاعر کا یہ ہوتا ہے کہ اس ذہنی تشبیہ کو جو جگہ کی طرح ذہن میں کبھی موبہم کبھی واضح بھرتی رہتی ہے ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے کہ پڑھنے والوں کے تخیل میں جو تخیلی پیکر اُکرنے کی صلاحیت موجود ہے اُس کو چھپڑ جگائے اور اس طرح شاعر اپنے تخیل کی قوت یعنی تشبیہ الفاظ کی مناسب سے پڑھنے والے کو مجبور کر دے کہ اس کے تخیل کے پردہ پر بھی دیا ہی تخیلی پیکر پیدا ہو جائے۔ اعلیٰ شاعر کے کلام کا مطالعہ اسی وجہ سے انمول شے ہے کہ ایسے شاعر کے تخیل کے جادو سے ہمارے تخیل کی پیدا کرنے والی قوت جاگ اُٹھتی ہے اور اس دنیا میں پیدا کر ڈالی قوت سے کام لینے میں۔ خواہ اس قوت کی جولان گاہ مسہری ہو خواہ ادبیات موجد کی تجربہ گاہ ہو یا مصنوعات کا کارخانہ (درک شاپ) جو مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہی اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔

اب اگر آپ نے شاعری کی اس تعریف کو سمجھ لیا ہے تو گویا اس مضمون کی پہلی قسط کا جو منشا تھا وہ پورا

ہو گیا۔ مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں کہ آپ اس تعریف کو تسلیم بھی کریں۔ دوسری قسط میں اس تعریف کی روشنی میں اردو شاعری پر نظر ڈالنی مقصود ہے اور صرف اتنی استدعا ہے کہ دوسری قسط کے پڑھنے کے دوران میں آپ اس کا خیال نہ فرمائیں کہ جو کچھ اردو شاعری کے متعلق لکھا جائے گا وہ کہاں تک آپ کی شاعری والی تصویر کے مطابق ہے بلکہ آپ کی اس پر نظر رہے کہ جو تعریف شاعری کی اس تحریر میں پیش کی گئی ہے اس کے مد نظر اس ناچیز راقم کے خیالات اردو شاعری کے بارے میں درست ہیں یا نہیں رہا یہ امر کہ وہ خیالات آپ کے نقطہ نظر سے مغالطہ انگیز ہیں یا مغالطہ سے پاک ہیں ایک بے تعلق سی بات ہے اور مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔

حامداً و صلیاً
میلادِ نبوی ﷺ

(از فقیرِ مکرر جناب سید ہاشمی صاحب)

کہیں کہیں نکل آئے ہیں پھول کا نٹوں پر
کہ جھاڑیاں ہوئیں گلشن کے نام سے آباد
کیا کسی نے نہ خاشاک و خار کو پھر یاد
نفوسِ چند کالے اہلِ ارضِ صدمہ ہے کہ سجدہ گاہ ملائک ہے خاکِ آدم زاد

جھکے ہوئے ہیں ستارے کہ آج کس کے طفیل
ہوئی ہے عرش سے ادنیٰ زمینِ سفلہ نژاد
علیہِ صلِّ و سلم و آلہ الامجاد

مقدمہ دیوان درد

(از جناب مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شردانی۔ الخطاب بہ نواب صدریہ جنگ بہادر)

کوئی درد آشنا کہہ گیا ہے

اگرچہ شاعرانِ نغمہ گفتار
زیک سا غوریں بزمِ اندمست

ولے۔ بابادہ بعض حریفان
زیر چشم ساتی نیز میوست

مشو منکر کہ در اشعارِ ایں قوم
ورلے شاعری چیزے دگرست

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے ”ورلے شاعری“ مضامین سے اردو ادب فیضیاب ہوا ہے

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و درن کہاں!

عموماً اردو شاعری کا سرمایہ نازِ سخنِ ظاہر کے انداز میں جن میں حسنِ بیان نے چارچاند لگا دیئے ہیں۔

خواجہ صاحب کی چشمِ حق میں جمالِ حقیقی کے جلووں سے منور تھی۔ وہی نور انکے کلام میں تاباں ہے۔ میر تقی

میر لکھتے ہیں: ”چکین خیالِ ادراکِ معنی دامنِ دامن“ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا پایہ عام شاعری

سے بالاتر ہے۔

ادبِ اردو سید اس مسعود صاحب کے خاندان کی سرپرستی کا برسوں سے منت پذیر ہے۔ سرسید نے اردو

نثر کو ”بیانِ مطالب“ کی قوت بخشی، نکتہ شناس ”پوتے“ نے نظمِ اردو کی خدمت کی۔ ”انتخابِ زرین“ کی اشاعت سے

اردو نظم کا نام روشن کیا۔ سونے میں سہاگا ڈالا۔ اساتذہ اردو کے دوا دینِ خوبی ذوقِ شاعری سے شائع

کرنے کا اہتمام کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ”دیوانِ درد“ بھی ہے۔ شردانی دہقانِ مقدمہ نگاری پر مامور ہے۔

عینِ سعادت کہ خواجہ صاحب کی بزمِ ادب میں باریابی کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ع

آیا بود کہ گوشتِ چشمے بہا کنند

لے دیوانِ مطلعِ نغمی ہادیوں میں زیرِ طبع ہے۔

خواجه صاحب کے حالات نام خواجہ میر درد تخلص صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ آبائی سلسلہ بارہویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤ الدین نقشبندی قدس سرہ سے اویسی بیویں پشت میں حضرت

مام عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مادری سلسلہ نسب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ خواجہ صاحب کے والد کی والدہ بھی حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھیں۔ والد کا نام خواجہ ناصر۔ عندلیب تخلص نانا میر سید محمد حسنی تھے جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے۔ نواب صاحب پانی پت کے سر کے میں نادر شاہ کے مقابل میں شہید ہوئے۔ جہانکشاے نادری میں انکا ذکر ہے۔ میرزا رفیع سودا کے مدوح تھے۔ خواجہ صاحب کے نسب کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے فاضل غلیباں کی ہیں۔ ہمارا بیان خواجہ صاحب کے علم الکتاب سے ماخوذ ہے۔ نسکین پرانی دلی میں تھا۔ اسی محلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی سکونت تھی۔ اُچڑے دیار کی آبادی و مردم خیزی۔ اللہ اکبر!

خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں دارہ ہندوستان ہوئے تھے۔ خواجہ محمد ناصر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مناصب داروں میں شامل تھے آخر منصب ترک لڑکے یاد الہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت قبلہ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت تھے۔ حضرت شاہ گلشن بیرہجت میں ناہ گلشن کی نسبت خواجہ صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ انکے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے۔

لے اس تخلص میں ایک خاص لطف ہے۔ حضرت شاہ گلشن حضرت شاہ محمد وحدت گل کے مرید تھے۔ اب شجرہ تخلص ملاحظہ ہو۔

گل	شاہ محمد وحدت
گلشن	حضرت شاہ سعد اللہ
عندلیب	خواجہ محمد ناصر صاحب
درد	خواجہ میر صاحب
اثر	خواجہ محمد میر صاحب

دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے تھوڑا گلشن ہوا۔ گلشن نے نالہ عندلیب پیدا کیا۔ نالہ عندلیب ”درد“ جلوہ افروز ہوا۔

درد سے ”اثر“ ایں سلسلہ ازطلعے نابست + ایں خانہ تمام آفتابست

فن موسیقی میں کامل مہارت مٹی جج سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی طرح میں فرماتے ہیں ست
چوں مقع صد بار از فقر من گل میکند و رفیری بہرہ مند از فیض شاہ گلشن

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روح پر فتوح سے طریقہ محمدیہ حاصل کیا۔ اُن کی تصنیف ”نالہ عنذلیب“ کو
حجم اٹھارہ سو صفحے کا ہے جس کو آزاد نے ”ایک رسالہ“ لکھا ہے۔ ازبان فارسی ہے۔ قصے کے پیرایہ میں بھاری
بلند اور مطالب عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ موقع پر کثرت سے اشعار درج ہیں۔ وجہ تصنیف خود یہ بیان فرمائی
ہے کہ ”اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے بیوقوف طریقہ کے جو یا تھے۔ ملا احکام
شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ۔ بعض جوان مذہب شیعہ سنی کی تحقیق چاہتے تھے بعض اخلاقی ستودہ
کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشق مجازی کی حکایتوں کا شوق تھا۔ اہل عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت
قبلہ عالم نے رحلت فرمائی۔ اولے تعزیت کے لیے اعزہ اور اجاب کا مجمع میرے مکان پر ہوا۔ اُسی موقع پر افسانہ کے
پیرایہ میں ”بزبان ہندی“ مطالب بالا کے جوابات خواجہ صاحب نے بیان کئے تین شب و روز یہ صحبت رہی۔
اپنے اپنے مطالب کے جواب پا کر سامعین پر عجب عالم طاری ہوا۔ سامعین مہر ہوئے کہ اس افسانہ کو قلب بند کردوں۔
عرصہ تک نالہ۔ آخر اشارہ غیبی پا کر فارسی زبان میں لکھ دیا۔ طریقہ تالیف یہ تھا کہ عشا کے بعد مخصوص اجاب کے
رد و رد زبان بیان کرتا۔ میر درد لکھتے جاتے۔ اچانک اذہ نہ ہوتے تو بیدار میرے مرید قلب بند کرتے کبھی وہ بھی نہوتے
تو خود میں ہی لکھتا جاتا اس طرح ۳۵۷ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ ”نالہ عنذلیب“ نام پایا۔ میر درد صاحب نے تاریخ لکھی ع
نالہ عنذلیب گلشن ماست

کتاب کو پڑھو اور کمال اور بیان کی قوت کا اندازہ لگاؤ۔ خواجہ عنذلیب صاحب نے ۶۶ برس کے سن
میں شعبان ۳۵۳ھ میں رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہ۔

خواجہ میر درد ۳۳۵ھ میں پیدا ہوئے تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی تفصیل تحصیل نظر سے نیس گزری۔ لیکن
تصانیف شاہ میں کہ نقلی اور عقلی علوم میں کامل تھے۔ خصوصاً علم الکتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر۔
حدیث۔ فقہ۔ تصوف۔ اور معقولات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ ابتدائے شباب میں دنیا دار رہے۔ جاگیر اور معاش
کے اہتمام میں پوری مہم و دُور کی۔ ۴۱۱ھ لے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اٹھائے۔ ۶۸۔ برس کی عمر میں جذبہ

حق نے اپنی طرف کھینچا۔ سب کو چھوڑ کر اُدھر چلے۔ لباس درویشی پہن کر آستانہ بھاناں پر سر جھکا دیا۔ ۳۹ برس کی عمر میں خواجہ غنایب صاحب کی رحلت کے بعد مدنی شیخ ارشاد ہوئے۔ اور آخر دم تک قدم نہ ہٹا۔ مصیبتوں کے دریا چڑھے اور اُترے۔ یہاں پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ انہی مصائب میں حملہ نادری بھی تھا۔ خواجہ صاحب بارہویں صدی ہجری کے اولیائے کبار سے ہیں۔

تصنیف کا شوق ابتدائے عمر سے تھا اور آخر عمر تک رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ ”اسرار الصلوٰۃ“ لکھا۔ انتیس برس کی عمر میں رسالہ ”آوردات“ لکھا۔ رسالہ مذکورہ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ایک مدت تک اُس کی شرح ”علم الکتاب“ لکھی۔ علم الکتاب کے بعد ”نالہ درد“ لکھا جو ۱۱۹۱ھ میں پورا ہوا۔ میر اثر نے تاریخ کہی۔ ع۔ نالہ غنایب دروین ست ”نالہ درد“ کے بعد ۱۱۹۱ھ میں رسالہ ”آوہ سر“ ختم ہوا۔ تاریخ از میر اثر۔ ع۔ آوہ سر دمانید گرمی رفتار ما۔ ”آوہ سر“ کے بعد رسالہ ”دردِ دل“ کی نوبت آئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسالہ ”شمعِ محفل“ لکھا گیا۔ دونوں کو ساتھ لکھنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہو کہ ”نالہ درد“ ”آوہ سر“ کی تالیف کے بعد جب رسالہ ”دردِ دل“ لکھنا شروع کیا تو خیال آیا کہ اس کے بعد ایک رسالہ ”شمعِ محفل“ کے نام سے لکھوں گا۔ مگر چونکہ ۱۱۹۱ھ میں ۳۹ برس کا ہو چکا فرصت منقود۔ لہذا دونوں کو ساتھ ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ صفر ۱۱۹۱ھ میں دونوں رسالے ختم ہوئے۔

فنِ موسیقی میں خواجہ صاحب کو پورا ذہل تھا۔ میاں فیروز خاں گوتیوں کا اُستاد حاضر ہو کر فن کے نکتے تحلیل کرتا۔ دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ہر مہینے میں ایک مجلس سماع مکان پر ہوتی اس طرح کہ قوال بلا طلب حاضر ہو جاتے اور جب تک اُن کا دل چاہتا سنا تے اور چلے جاتے۔ نہ بلائے جاتے نہ روکے جاتے۔ سماع کی نسبت خواجہ صاحب فرماتے ہیں: ”سماع من جانب اللہ است وحق بریں امر ہے وقت گواہ کہ خود بخود گویند گاں می آیند و مادام کہ می خواہند می سرانید۔ نہ آنکہ فقیر اینہا را می طلبد و شنیدن سرود در اچوں دیگران عبادت می فہد بلکہ ہاں معاملہ نہ آنکہ ریکتم نہ ایں کار ریکتم در پیش ست و عقیدہ من ہاں ست کہ عقیدہ بزرگان من ست۔“ (نالہ درد۔ ۳۷)

۲۲ صفر ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات از بیہ دار

تاریخ قطعہ

آفتابِ امتِ دین محمد خواجہ میر محمد عظیم علی و دارثِ اثنا عشر

حضرت درد آئینہ از درد فراقی غلب
نالہ یا ناصرش میسر دہر دہما اثر
جیف گرد دنیا بمرثعت و ہشتم سالگی
جانب اعلا علی سین او کردہ سفر
بندہ بیدار کان ہست از غلامان شکی
جست از وقت وصال در روز و شب سخن
باب پر شب ماندہ ہافت کرد و ادبلا و
ہائے بود آدینہ و بست چہارم از صفر

اس تاریخ میں خواجہ صاحب کی عمر اٹھ برس کی لکھی ہے۔ حالانکہ خود خواجہ صاحب کے بیان سے چھٹا برس معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ آگے چکر معلوم ہوگا۔ مزار شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب کے متصل ہے۔ میں بھی فانی خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ واللہ علی ذلک تنوع میں میصر خواجہ صاحب کے زبان پر تھا۔ ع۔ در دوم جاتے ہیں پرچھوٹے اثر جاتے ہیں۔ میر اثر خواجہ صاحب کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ یہ سلسلہ خواجہ محمد نصیر تخلص بہ "رنج" تک جاری رہا جو خواجہ صاحب کے نوٹسے تھے۔ خواجہ صاحب کے صاحبزائے ضیاء الدین صر تھے۔ تخلص "الم" تھا۔

تصانیف | بیان بالا سے خواجہ صاحب کی تصانیف کے یہ نام معلوم ہوئے۔ اسرار الصلوٰۃ رسالہ واردات۔ علم الکتاب۔ نالہ درد۔ درد دل۔ آہ سرود۔ شمع مخلص لکھے علاوہ دیوان فارسی۔ دیوان اردو۔ جملہ تصانیف بالاشائع ہو چکی ہیں۔

اسرار الصلوٰۃ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نماز کے ارکان ہنگامہ کے اسرار سرسیر کے بیان فرمائے ہیں۔ واردات۔ یہ ایک سو گیارہ واردات کا مجموعہ ہے۔ ہر وارد کا نام جدا گانہ ہے۔ مثلاً۔ وارد اول۔ فاتح الواردات۔ وارد ثانی۔ "نور من اللہ" علی ہذا القیاس۔ وجہ تالیف "واردات" کی یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اکثر اوقات غلبہ حالات میں (جو عبارت ہشت متشابہہ کی حالت سے اور استیلاء تاء سے) جو معانی دل پر نکشف ہوتے تھے وہ رباعیوں کی صورت میں منظوم ہو جاتے تھے جب یہ رسالہ تمام ہو گیا تو اس میں خواجہ غلب صاحب کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند فرمایا گیا۔ رسالہ واردات میں معرفت و حقیقت کے مطالب عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ ہے۔ اول و آخر رباعی ہے۔ درمیان میں شارحانہ نشر نمونہ۔ وارد اول۔

رباعی اول

در خلوت ماکہ رشک صد انجمن ست
با خویش زباں چو شمع گرم سخن ست

عالم آئینہ جانہ است و مارا ہر سو کہ اشارت ست با حقیتین ست

رباعی آخر کی

از فیض تو ہر خس را بہ معمور آمد در لطف تو ہر غم زدہ سرور آمد
بخت سیش رخت ز عالم پرست ہر سایہ کہ زیر سایہ تو آمد
وارد دویم۔ رباعی آخر کی۔

ہستی و عدم خراب نہانہ اوست امکان و وجوب مست پیمانہ اوست
چشم دل تو اگر حقیقت بین ست ہر ذرہ خلق روزن خانہ اوست

”علم الکتاب“ رسالہ بالا کی شرح ہے جو میر اثر کی فرمائش سے لکھی گئی۔ باریک خط کے بڑے بڑے صفحہ ۶۴۸ ہیں۔ خواجہ صاحب کے علم الہی کا بحر اور کمالات معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا عربی طویل عبارتیں بے تکلف غایت بلاغت کے ساتھ مثل چشمہ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر دلچ ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب انکے انوار سے پر نور و معمور ہو جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت و مدلل فرمایا ہے۔ ”نالہ درد“ میں فرماتے ہیں کہ ”نالہ عندلیب“ اور ”علم الکتاب“ طریقہ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت و قوت تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ ہے۔

”نالہ درد“ ”علم الکتاب“ کے بعد لکھا گیا دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

”علم الکتاب“ کے ختم ہونے پر جو مطالب ”قلب حیران پر تراوش کرتے تھے اُن کو میر اثر جمع کرتے گئے۔ جب مجموعہ تیار ہو گیا ”نالہ درد“ نام رکھا۔ اس میں لفظ ناصر کے محمد و اسم نالے ہیں۔ یہ رسالہ سوز و گداز اور دلوریزی سے معمور ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ۷

درد می باردار رسالہ درد شرح دردِ دل ست نالہ درد

”آہ سرد“ اس میں بھی ۳۴ سرد آہیں ہیں۔ ”نالہ درد“ و ”آہ سرد“ دونوں مل کر گویا ایک کتاب ہیں۔

”اللہ درود“ سرودوں کو ختم ہو گئے۔ مگر درود دل بدستور تھا۔ ناچار درود کو لکھا۔ اس میں ۳۴۱۔ درود میں ہر درویش مطالبے فاضل کی شرح ہے۔
 شمع محفل۔ اس میں ۳۴۱ نوں میں اور ہر نور معارف بلند سے معمور۔ رسالہ کا آغاز خواجہ صاحب کی عمر کے
 باسٹھویں سال میں ہوا تھا۔ چھیا سٹھ برس کی عمر تک درود کے ساتھ اس کی تحریر جاری رہی۔ اس رسالہ کا خاتمہ
 حیرت خیز اور واقعہ عبرت انگیز ہے۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔ ”اب میری عمر کا چھیا سٹھواں سال ہے اور یہ رسالہ ختم
 ہو رہا ہے۔ مبارک اسم اللہ کے بھی عدد ۶۶ ہیں صحیفہ واردات ۱۰۰۰ ہجری میں ختم ہوا تھا اسی سال والد عالی مرتبہ
 نے چھیا سٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی تھی جن اتفاق کہ اس رسالہ کا خاتمہ اس سال ہوا جو میرا سال ارتحال ہے
 یہ رسالہ ”شمع محفل“ کے ساتھ ۱۱۹۹ھ میں شروع ہوا تھا۔ ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہر یہ خاتمہ تو اتم ہے
 سکوت خاتمہ بالآخر راقم رسالہ سے خواجہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔ دیکھو اسی صفر کی ۲۴ تاریخ کو خواجہ صاحب
 نے رحلت فرمائی۔ یہ کیا تھا۔ سائنس کے رفعت اس سوچیں۔ ”شمع محفل“ کا نور (۳۲۹) اس راز پر روشنی ڈالتا ہے۔
 جہاں فرماتے ہیں کہ ”مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ سال ارتحال و حال انتقال تجھ کو پیشتر سے بتلایا جا رہا ہے اور یہاں ناگماں نہیں
 پہنچا۔“ چاروں مذکورہ بالا رسالوں میں یہ التزام ہے کہ سوائے اپنے اشعار فارسی کے اور کسی شاعر کا کلام درج
 نہیں کیا۔

”دیوان فارسی“ دیوان فارسی مختصر ہے ۱۳۰۰ ہجری میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیں ہیں۔
 رباعیاں ہیں۔ مخمس وغیرہ بھی ہیں۔ زبان کا وہی انداز ہے جو فارسی گو شعرائے ہندوستان آرزو وغیرہ کا ہے۔ معرفت
 کی قوت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے۔ ایک شعر سن لیجئے۔

فدائے نثار بطورِ دو عالم وجود ما

جوشید نثار تین ز جوش شراب ما

اس شعر سے زور کلام اور قوت نسبت کا اندازہ کیجیے۔ اگر ”نالہ درد“ وغیرہ کے اشعار بھی شامل دیوان ہو جائیں
 تو ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو جائے۔ مگر غزل فارسی۔

غزل

جوش ز بادہ توحید بہ میخانہ ما بحسردار و بگرہ قطرہ پیمانہ ما

بخودی پرده گشائے حرم دل باشد بسته احرام ریش لغزش مستانه ما
 دیدها آئینه باشد بامیدے که کند جلوه یار قدم رنج بهکشانه ما
 زینت وزین ناس باو مبارک بزنان ساز دنیا بکنز همت مردانه ما
 منت طبع رسا در دامنتم آشنا کرده بامعنی بیگانه ما

غزل

آئینه ایم فرماتا و حضور آئیم هر جلوه که داری در خود ترانا ایم
 عرفان تیز بین را حیرت گرفت آخر اکنون بد نور یا یا چشم نقی کشا ایم
 از آشنایے ما بیگانه گی ست اورا بیگانه وار هستیم از بسکه آشنا ایم
 ما چشم نقش پاییم دید تصور داریم گو در ریش فدا دیم اما بره نیایم
 او دلبر و دل آزار ما دل دست اده یارب چه پیش آمد آماده بلا ایم
 ما از وفا پرسیم تو از جفا بگوئی تا چند آزمائی تا چند آزما ایم

یاراں ز مهربانی دانند هر چه دانند

ما خوب می شناسیم لے درد انچه ما ایم

مترق

در دستان بگر بگشتم که لب خشک چشم تر دارم

وله

صبح روز فراق شام بود لے شب وصل شام تو سوخت

و

درد دست چراغی که درین آہ بگیرم
آئینہ بکف از دل آگاہ بگیرم

ادبِ اُردو | خواجہ صاحب اُردو شعرا کے تیسرے دور میں ہیں۔ تیسری ذرا معاصر تھے۔ دوسروں کے شعرا کی نسبت آزاد، بحیات میں لکھتے ہیں۔ زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے کہ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان جینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کی تاج و افسرتیار ہوتے ہیں..... یہ اپنی صفت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ انتہائی صفا پر کچھ لطافت پر کچھ لطیف زیادہ کر چکا اوس کی خوبی پر پردہ نہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ ان میں ڈوبنے ہو گئے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں۔ ”اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے کہ جنہوں نے زبان اُردو کو خرافات و تاثرات سے“

کلام بالا سے خواجہ صاحب کے ادبی صفات یہ واضح ہوئے۔ زبان کو پاک اور کلام کو آراستہ کیا۔
خراط و تار۔ اس سے بھی بڑھ کر شہادت میر تقی میر اور میر حسن کی ہے۔ میر صاحب جب اکبر آباد سے دلی آئے
تو خواجہ صاحب کی خدمت میں شرف اندوز ہوتے رہے۔ اُنکے مشاعرہ میں شریک ہو کر دار الخلافہ کے مذاق سے
آشنا ہونے اور اہل زبان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا موقع انکو ملا۔ میر صاحب کی ترقی دیکھ کر خواجہ صاحب
فرماتے۔ ”میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد“ جب وہ مشاعرہ خواجہ صاحب کے یہاں بند ہو گیا۔ تو میر صاحب نے انکی
فرمائش سے اپنے یہاں مقرر کیا۔ اپنے مشاعرہ کی نسبت کہتے ہیں۔ ”واللہ کہ بذاتِ ہمیں بزرگ ست“ میر صاحب کو صفا
اقرار ہے کہ انکا کمال خواجہ صاحب کے پاک انفاس کا منون کر م ہے چنانچہ کہتے ہیں۔ ”الحمد للہ واللہ کہ حرفِ آن سر
سلسلہ خدا پرستان مؤثر افتاد۔ باطنِ آن خضر قافلہ اہل عرفاں کہ از طہارِ ش ظاہر ترست ز د و کار کرد“ (دیکھو تذکرہ
میر تقی۔ حالات خواجہ صاحب) میر حسن نے بھی ابتداءً ذوقِ شاعری کی نخستگی خواجہ صاحب کی صحبت میں حاصل کی

کریم الدین لکھتے ہیں: ”بچپن سے میر حسن کو شوق نظم کا تھا۔ جب اس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں رہے اسی فیضِ صحبت سے وہ پہلے ارادہ پر مضبوط اور قائم رہے۔“ (ترجمہ کاٹنڈوی ٹاسی) خود میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ ”میرے استاد میر خیار ہیں مگر مجھ سے اُنکے طرز کا کما حقہ بننا نہ ہو سکا۔ اس لیے میں نے دوسرے بزرگوں کی مثل خواجہ میر درد۔ میرزا رفیع سودا اور میر تقی میر (پیر وی کی)۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت خاص یہ ہو کر اُردو شاعری کے قاب میں حقیقت و معرفت کی روح بھونکی۔ مردہ جسم کو زندہ کیا۔ نمایاں وصف یہ ہے کہ اُردو ادب میں۔

پیدا کیا۔ میر تقی میر اور میر حسن اُن کے صحبت یافتہ ہیں۔ اثر اور قائم اُن کے شاگرد ہیں۔ نیز فراق۔ مذاقِ صحیح | بھکاری داس عزیز نثار۔ آلم صاحبزادہ ہیں۔ ایک قریبی رشتہ دار شاعرِ مخلص ہیں۔

میرا ترکی مثنوی ”خواب و خیال“ افسوس ہو کہ اب تک دستیاب نہیں ہوئی مگر جو اشعار اُس کے محفوظ ہیں اُن سے اور خواجہ حالی کی شہادت سے عیاں ہو کہ مثنوی مذکور ایک نمونہ تھی حسنِ ادب کا۔ آبجیات میں آزانے تصریح کی ہو کہ میر حسن جو انداز بیان و لہجہ سے لائے تھے وہ اُن کے خاندان نے آخر تک قائم رکھا۔ چنانچہ میر انیس کہتے تھے کہ ”یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اُس طرح نہیں فرماتے“ نہ صرف یہ بلکہ انداز گفتگو۔ طرزِ معاشرت میں بھی آخر تک امتیاز قائم رہا جن صاحبوں نے نفیریس اور میرزا آوچ کو دیکھا ہو وہ میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ اب یہ کہنا بجا نہ ہو گا کہ مثنوی خواب و خیال۔ مثنوی بدر میر اور راہی انیس سے جو فخر و شرف ادب اُردو کو حاصل ہوا وہ خواجہ صاحب کے فیضِ تربیت کا ممنون ہے۔

خواجہ صاحب شاعری کی نسبت ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ اس سے اندازہ کرو کہ کسی پاکیزہ شاعری کا مفہوم خواجہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ ”شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مرد آدمی اپنا پیشہ بنالے اور اُس پر ناز کرے۔ البتہ انسانی ہنروں میں سے ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور در بدر پھرنے کا آلہ نہ بنے اور مدح اور سچو دنیا کمانے کے لیے نہ کہے ورنہ گدگری کی ایک صورت ہو اور طامعی اور بھنسی کی دلیل“ (نالہ درد ۲۰)۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ”اس سے پہلے بت ہی کم آدمی ایسے نظر آتے تھے جو سلسلہٴ مجاہدانِ سخن“ ہوں۔ آپ کہیں دوسروں سے سنیں۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دل پر جو معارف تازہ وارد ہوتے تھے اُن کو سخن فہم حکمتِ سخنوں کے ماسنہ بیان کر دوں اور اُن سے بہکلاں ہوں نتیجہٴ انسانیت ہو اور نشانِ آدمیت۔ کلام مر و موعجب لذت رکھتا ہے اور دل کو

شگفتہ کر دیتا ہے۔ علامہ البیان کا یہی خلعت ہے جو خلیفۃ اللہ کو پہنایا گیا ہے۔ پاک فرشتوں کی سجدہ و بیہ مشیت خاکِ انیمت کی بدولت ہوئی ہے۔ اب معنی فہم انسانوں سے زمانہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ بعض جہلا تو حید اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عین اسکا دیہی بعض خلجوں مذہب و ملت کی باتیں اس طرح کرتے ہیں جو نشا، فساد ہو جاتی ہیں۔ کچھ خام طبع باہم مکر جوشِ اخلاص کا اظہار کرتے ہیں اور بیہودہ گوئی کے معرکے گرم کرتے ہیں عقل و فہم کہاں۔ خدا ایسی مصلحتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔“

خود اپنی شاعری کی نسبت فرماتے ہیں ”فقیہ کے اشعار باوجود رتبہ شاعری کی رعایت کے۔ پیشہ شاعری اور اندیشہ ظاہری کے نتائج نہیں۔ بندہ نے کبھی شعر بد دلن آمد کے۔ اہتمام آور دے موزوں نہیں کیا اور بہ تحلف کبھی شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا۔ کبھی کسی کی مدح یا سچو نہیں لکھی۔ کبھی فرمائش یا آزمائش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا۔“

علم الکتاب ص ۹

عشقِ مجازی کا مفہوم خواجہ صاحب کے یہاں معمولی سطح سے بلند تر ہے۔ فرماتے ہیں ”بو الہوسی عشقِ مجازی نہیں ہے اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے پیر کی محبت وہ عشقِ مجازی ہے جو مطلوبِ حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ دوسرا فرد از عشقِ تباں ہے در دامنِ خواستم در دلدے۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ”میں کبھی رسمی عشقِ بازی میں گرفتار نہیں ہوا۔ لیکن دل عاشقانہ صاوقانہ پایا ہے۔ محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گزارا ہے۔ دوستانِ ہمدم جب جمع ہوں اور محفلِ زندہ دلی“ گرم فرمائیں اس ”مردہ دلی“ فرسٹر خاطر“ کو بھی یاد کر لیں اور فاتحہ خیر سے شاد۔“

مضامین بالا سے واضح ہوا ہو گا کہ خواجہ صاحب کی شاعری کی نوعیت اور تخیلِ شعر کی حقیقت کیا تھی؟ خواجہ صاحب کا دیوان اُردو و مختصر ہے۔ عام طور پر جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں بہت غلط ہیں۔ اسی لیے جناب سید راس مسعود صاحب کو صحیح نسخے کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اور بہت صحیح پیدا ہوا حیدر آباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان در دے کے نسخے سیرے ہاتھ لائے۔ سید صاحب کی فرمائش سے میں نے سید معین الدین صاحب شاہجاں پوری (مترجم بنوینِ عظم وغیرہ) کو تصحیح و مقابلے کی تکلیف دی۔ اہل ادب کو ممنون ہونا چاہیے کہ نہایت محنت و دیدہ ریزی سے انھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمادیا اسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع کے بعد جب میں حیدر آباد سے عیوب گنج

آیا تو کتاب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۳۵۷ھ میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے اور متعدد صحیح نسخوں کے مقابلہ سے چھاپا گیا تھا۔ میں نے اس نسخہ سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور انھوں نے مہربانی سے محنت کر کے مقابلہ کیا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلنا صحت میں بھی اور مقدار کلام میں بھی۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بعض ایسے الفاظ ضرور ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جو زبان آج فصیح سمجھی جاتی ہے کل اُس کے کتنے الفاظ غیر فصیح اور نامانوس مانے جائینگے۔ لیکن اسی کے ساتھ معرفت اور حقیقت کا رنگ۔ کلام کی پاکیزگی۔ تخیل کی بلندی و رد کی چاشنی سوز و گداز کا کُنڈن ہر جگہ عیاں ہے تاہاں ہے اشعار ذیل اس دعوے کے شاہد ہیں:-

غزل

مقدور ہیں کب تھے وصفوں کی رقم کا حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس منہ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے کیا تاب گزر ہوئے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں تھے سایہ میں سب شیخ و برہمن آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیو و حرم کا
ہر خوف اگر جی میں تو ہر تیرے غضب کا اور دل میں بھر دسا ہی تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آکھ تولے درد کھلی عقی
کیسینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

دیگر

مژگان تر ہوں یا رگ تاک پریدہ ہوں جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسید ہوں
کھینچے ہے دور آپ کو میسری فروتنی افتادہ ہوں پہ سایہ قد کشیدہ ہوں
ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ درگاہ ہر صبح مثل صبح گر میاں دریدہ ہوں

کرتی ہوئے گل تو میرے ساتھ اختلاط
پر آہیں تو موج نسیم وزیدہ ہوں
چاہے ہو یہ مری پیشِ دل کہ بعد مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں
لے دردِ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرہ اشک چلکدہ ہوں

دیگر

نہ طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ
گردل ہوں تو آزرده خاطر ہوں تو رنجیدہ
ہم گلشنِ دوراں میں لے خفگی طالع
سر سبز تو ہیں لیکن جوں سبزہ خوابیدہ
لے شورِ قیامت رہ ادھر ہی میں کتنا ہوں
چونکے ہوا بھی یاں سے کوئی دل شوریدہ
اوروں سے تو ہنستے ہوں نظروں سے مٹا نظریں
ایدھر کو نظر کوئی بھینکی بھی تو زد دیدہ
مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا بارے
زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامہ پیچیدہ
بدخواہ سبھی عالم کو ہوئے تو ہو لیکن
یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل دیدہ
کرنا ہے جگہ دل میں جوں ابرو کی پیوستہ
لے دردِ یہ تیرا تو ہر مصرعہ چسپیدہ

دیگر

کاشکس تا شمع نہ ہوتا گزر پر روانہ
تم نے کیا قمر کیا۔ بالِ دیپر پروانہ
شمع کے صد تے تو جتنے بھی دیکھا تھا آؤ
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ
کیوں لے آتش سوزاں میں یو جاتی ہو
سو جتا بھی ہو تجھے کچھ نظرِ پروانہ
ایک ہی جُست میں لی منزلِ مقصود لے
راہِ زُرشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
شمع تو جل بھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے دردِ میں کس سے خبر پروانہ

اُس کی بہارِ حسن کا دل میں ہائے جوش ہے دیگر فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یگل فروش ہے
 خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل حسنِ بلائے حتم ہے نغمہِ وبالِ گوش ہے
 ہوئے تو درمیان سے اپنے تئیں اٹھائیے بار نہیں ہو اور کچھ سری وبالِ دوش ہے
 نالہ و آہ کیجیے خونِ جگر ہی پی سیے عہدِ شباب کہتے ہیں موسمِ ناؤ نوش ہے
 خیر تجھے جو چاہیے بدرقہ جنوں نہ چھوڑا ہم نے جہاں کی سیر کی۔ رہزنِ غنچ ہوش ہے
 غیرِ طال زاہدا۔ کیا ہے طریقِ زہد میں دل ہوشِ گفہ جس جگہ کو بچے فروش ہے

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں
 درد اگر لباس ہے دیدہ عیب پوش ہے

دیگر

آفتِ جان و دل تو یاں وہ بہت خود فروش ہے پہلے ہی جس کے پیشکش۔ صبر و قرار ہوش ہے،
 دل کو سیاہ مست کر کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے کہتے ہیں کعبہ اس کو۔ اور کعبہ سیاہ پوش ہے
 کس کی یہ موتی ہے صبا گنت و شنید باغ میں غنچے سمی وہاں ہیں گل بھی تمام گوش ہے
 آتشِ گل جنوں مرا گرم کرے سوہنیس سینہ ہمیشہ آگ ہے دل میں سدا ہی جوش ہے
 حادثہ زمانہ کیا تیسری جفا سو کیا بلا ہم کو ایک مصیبت چاہی جیسے نہ چھپ سکی
 ہم نے تو ایک مصیبت چاہی جیسے نہ چھپ سکی آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا یاں
 دور نہیں ہوا ہمیں رنجِ شعور سا قیا اک دوسہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنجِ دغم سے یاں درد نہ جی چھپائے

بارِ سمی اٹھائیے جب تئیں سری دوش ہے

آز میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ جو حالات اس مقدمے میں لکھے گئے ہیں ان کا ماخذ خود خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں بعض حالات یا مضامین ایسے بھی درج ہوئے جو دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں ان کا حوالہ موقع پر دیدیا گیا ہے۔

میں ممنون ہوں کہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی سے قیمتی مدد ملی ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں نہ لکھوں کہ خواجہ صاحب کی نادرا و نایاب تصانیف (علم الکتاب) و نالہ درد وغیرہ) اور خواجہ عنایب صاحب کی نالہ عنایب کی اشاعت کی سعادت نواب سید نور الحسن خاں مرحوم بھوپالی کو نصیب ہوئی۔ یہ دین و علم کی ایسی بیش بہا خدمت تھی جو ہمیشہ اہل دل کو ان کا ممنون رکھے گی۔ جزا لا اللہ خیرا

اللہ بس۔ باقی ہوس

نوٹ۔ یہ دیوان جس کا یہ مقدمہ ہے سلسلہ آصفیہ مطبع نظامی بدایون کا تیسرا نمبر ہے۔ قیمت مجلد چار۔ غیر مجلد چار۔

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟

(نور محمد بنکریاب رحمہ اللہ غاں صاحب بی لے)

(۱)

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی تمہیں عیش کا ہی جو دھیان تھا تمہیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے!

(۲)

بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا مرے واسطے یہ بہشت تھی تمہیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے!

(۳)

مری چاہ تھی بڑی قیمتی میں غریب تھی یہ امیر تھی تھے امیر تم یہ نہ چاہ تھی میں امیر تھی یہ فقیر تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے!

(۴)

نہ تھا اس جہان میں آسرا مری جان تھی یہ جہان تھا مرے سکھ تمہیں تمہیں چین تھے تمہیں چاہ ہے یہ گمان تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمہیں یوں مرے!

(۵)

مرے حسن کی جو ہر رتھی مری کھل رہی تھی کلی کلی یہ تھیں پہ میں نے نثار کی مراد من لیا مری جان لی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

(۶)

مری چاہ لی مراد لی جو طلب کیا وہ تھیں دیا . جو نہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ دل پھرا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

(۷)

تھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی مگر آرزو نہ ضرور تھی تھیں دیکھ لیتے کبھی کبھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

(۸)

مرا پاش پاش یہ دل ہوا مری چاہ کا وہ دیا بچھا مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا نہیں اب بھی وہ کسی اور کا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

(۹)

نہیں اب بھی وہ کسی اور کا پہ نہ اٹھا سا مراد دل رہا تھیں یاد آؤں میں پھر اگر تو یہ پاؤ گے کہ وہ خواب تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

(۱۰)

مرے دل سے ہو گا یہ کب بھلا تھیں مے سکوں کوئی بدو وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا مرے دل سے آئے گی پر صدا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تھیں یوں مرے!

اُردو رسم خط میں اصلاح

از

جناب ڈاکٹر عبدالسار صدیقی صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)
اُردو رسم خط کی اصلاح کے متعلق متعدد مضامین اُردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ کافی بحث
ہونے کے بعد ایک مجلس حیدرآباد میں امور بحث طلب کے فیصلے کے لئے منعقد ہوئی جس میں اصحاب
ذیل شریک تھے۔

ڈاکٹر عبدالسار صاحب صدیقی، ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج، مولوی عنایت اللہ صاحب
بی اے ناظم دارالترجمہ، مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ، مولوی وحید الدین صاحب مسلم پرنسپل
عثمانیہ کالج، مولوی سید احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع ناڈیر، مولوی سجاد مرزا صاحب بی اے (کلیٹ)
پرنسپل مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ اورنگ آباد۔ عبدالحق۔

بعض اصحاب بوجہ بعد اور بعض اس وجہ سے کہ تاریخ جلسہ عید کے متصل تھی۔ شریک جلسہ نہ ہو سکے
ان میں سے بعض صاحبوں نے بذریعہ تحریر اپنی رائے بھیج دی یا جن خیالات کا اظہار وہ اپنے مضامین میں
فولکلے تھے ان کا حوالہ دیدیا۔ ڈاکٹر عبدالسار صاحب صدیقی نے جو تجاویز طے میں پیش کیں وہ اگر کان مجلس
نے تقریباً سب منظور کر لیں جو اس مضمون کے پڑھنے سے واضح ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تجاویز میں
اُردو ٹائپ کی مشکلات کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں سہولت
پیدا کی جائے۔ مثلاً انہوں نے اعاب بجائے حروف صحیح کے حروف علت پر رکھے ہیں۔ یعنی ٹائپ میں و
اور حقی مع اعاب رہیں گے۔ جہاں ضرورت ہوگی لگا دیئے جائیں گے۔ اگر برعکاس اس کے مروجہ طریقہ
پر عمل کیا جائے تو تمام حروف مع ان اعاب کے الگ بنانے پڑیں گے اور اس سے ٹائپ میں جو درست

بڑھ جائے گی وہ ظاہر ہے۔ امید ہے کہ جو صاحب اس مضمون کو مطالعہ فرمائیں گے وہ اس اصول کو مدنظر رکھیں گے۔
علاوہ اس کے ارکان مجلس نے بالاتفاق اوقات کے لئے مفصلہ ذیل علامات اور اسامیہ مقرر کئے

انگریزی نام	اردو نام	علامت
فل اسٹاپ (Full stop)	وقفہ	-
کولن (Colon)	نیم وقفہ	:
سی کولن (Semi-colon)	رابطہ	;
کاما (Comma)	سکتہ	,
ان ورٹڈ کاما (Inverted commas)	واہیں	” “ (عبارت کا اوپر)
نوٹ آف انٹروگیشن (Note of Interrogation)	سوالیہ	؟
نوٹ آف انٹرجیکشن (Note of Interjection)	ندائیہ	!
برکٹس (Brackets)	قوسیں	()
دوٹس (Dots)	نقطہ	

املا کے متعلق بعض امور کسی دوسرے حصے میں فیصلے کے لئے پیش ہوں گے۔

ادید

اُردو، تحریر میں دو قسم کی خرابی ہے: (۱) ایک حروف صحیح سے (۲) دوسری حروف علت سے متعلق۔
(۱) اُردو کی الف بے میں کئی کئی حروف کی آواز ایک ہی ہے جیسے آ اور ع کی آواز ایک ہی ہے۔ اسی طرح ت اور ط کی، ث، س اور ص کی، ح اور ہ کی، ذ، ز، ض، اور ظ کی آواز ایک ہی اُردو کی ضرورت کے لئے صرف آ، ت، س، ہ اور ر کافی ہیں اور باقی حروف (ع، ط، ث، ص، ذ، ض، اور ظ) بے ضرورت ہیں اور اسی لئے یہ حرف صرف عربی لفظوں کے لکھنے میں کام آتے ہیں۔ ان حروف کے وجود سے لکھنے والے کو تکلف ہوتا ہے لیکن لکھی ہوئی عبارت کے پڑھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی

پس اس وقت ان ٹھٹ عربی حروف کو میں خارج از بحث تصور کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو دوسری قسم کی خرابی کے رفع کرنے کی تجویزوں تک محدود رکھتا ہوں۔

(۲) اُرود کی الف بے میں حرفِ علت کم ہیں اس لئے (ا)، ایک حرفِ علت کی آوازوں کے لئے لکھنا پڑا ہے؛ اور (ب) خیفِ علت کے نشان یعنی اعراب لکھے ہی نہیں جاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری تحریر میں تلبیس پیدا ہو گئی ہے اور پڑھنے والے کو عبارت کے صحیح پڑھنے میں مشکل سے کامیابی ہوتی ہے اور اسی لئے رسم خط میں اصلاح کی ضرورت لاحق ہے۔

اصلاح کا مقصود

- (۱) موجودہ کتابت کے التباس کو دور کرنا؛
- (۲) التباس کے دور کرنے کو ایسی علامتیں یا نشان مقرر کئے جائیں جو نامانوس نہ ہوں؛
- (۳) رسم خط کے مقرر کرنے میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ ٹھٹے کے چھاپے کے لئے جہاں تک ہو سکے آسانیوں پیدا ہوں؛

(۴) جہاں تک ہو سکے حروف کو اعراب (یعنی زبر، زیر، پیش) سے مستثنیٰ کرنا

اصلاح کی تدبیریں

- (۱) جہاں تک ہو سکے ہر لفظ الگ الگ لکھا جائے۔ کئی لفظوں کو ملا کر لکھنے سے چھپائی میں بھی دقت ہوتی ہے اور پڑھنے میں بھی "آپنے"، "تمنے"، "مینے"، "آپکیجہ تھیں"، "عرفانعلینا نصاحب"، "ہادیعلیٰ بیگ صاحب"، "جسدن"، "جسکو"، "اسیدن"، "مجھسے"، "نیکجینگا"، "نجانینگا"، کو اسی طرح غلط سمجھنا چاہیے جیسے عربی میں "سوف تعلمون" غلط سمجھا جاتا ہے۔ صحیح صورتیں یہ ہوں گی: "آپ نے"، "تم نے"، "میں نے"، "آپ کی خدمت میں"، "عرفان علی خاں صاحب"، "ہادی علی بیگ صاحب"، "جس دن"، "جس کو"، "اُسی دن"، "مجھ سے"، "نیکجینگا"، "نجانینگا"، "اودے پور"، "بے پور"، "شاہ جہان پور"، "قرن مگر" وغیرہ لکھنا چاہیے۔ اگر اس قاعدے

پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے تو ٹیپے کے چھاپے کے لئے حرف جوڑنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ بہت سے حرف اعراب سے مستغنی ہو جائیں گے۔

(۲) ہر لفظ کا اخیر حرف اُردو میں ساکن ہوتا ہے۔ اس لئے اُس پر جزم لگانے کی ضرورت نہیں۔

(۳) سوا لفظ کے اخیر حرف کے جس حرف صحیح پر کوئی علامت یا اعراب نہ ہو اُسے عموماً مفتوح

پڑھنا چاہیئے۔

(۴) لفظ کے اخیر حرف کے سوا جو حرف صحیح ساکن ہو اُس پر جزم کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔ لبتہ

اُردو فعل کے ماڈے میں جو ایسے حرف آئیں اُن کو جزم لگائے بغیر چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں جیسے کھیلنا، کاٹنا، جھپٹنا ہی، لپکتا تھا وغیرہ میں اگر ل، ٹ، ک پر جزم نہ ہو تو بھی ان کے پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ یہی حال اُن اُردو لفظوں کا ہے جو بہت عام ہیں جیسے اپنا دوسری، پانچواں وغیرہ۔

(۵) ہر مشدّد حرف پر تشدید کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔

(۶) جب آ مضموم یا مکسور ہو اور اُس کے بعد کا حرف، حرف صحیح ہو تو آ پر اعراب ضرور لگانا

چاہیئے۔ جیسے اس، اُس، ادھر، اُدھر۔

(۷) اُردو میں اگر آیا و کے بعد ہمزہ آئے تو اُس ہمزہ کے لئے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے بلکہ آ کے

بعد ہی اُس کے برابر ہمزہ لکھا جائے۔ جیسے آءِ ی، آءِے، کوءِ ی، بھاءِ ی، جاءِے، لاءِے، سوئے، کھوئے وغیرہ

(۸) دو لفظوں کے درمیان مناسب فاصلہ دیا جائے۔

(۹) جو مرکب لفظ دو یا تین لفظوں سے مل کر بنے ہوں اُن کے اجزاء الگ الگ لکھے جائیں۔ لیکن

اُن کے درمیان فاصلہ نہ دیا جائے۔ جیسے پن گھٹ، پوں پچلی، دل کش، دل چپ وغیرہ (مگر دل میں

دل پر) البتہ جو دو لفظ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے وصل ہوئے ہیں کہ کوئی آواز جاتی ہی رہی ہو وہ

باکر لکھے جائیں گے جیسے دِلارام، دِلالزار، سیلاب وغیرہ

(۱۰) فارسی اضافت کے کسرے کو ہمیشہ تحریر میں لانا چاہیئے۔ یہ جو دس قاعدے بیان ہوئے، تھوڑے

سے اہتمام سے ان پر آسانی سے عمل ہو سکتا ہے اور ان میں کوئی ایسی نئی بات نہیں جو نامانوس ہو۔ اب صرف و او کی کتابت کا معاملہ باقی ہے جو نہایت اہم ہے۔ اس کے لئے یہ گیارہ حوالہ قاعدہ میں نے تجویز کیا ہے:-

(۱۱) و اور ہی کی مختلف آوازوں کے لئے صورتیں بھی مختلف ہوں اور وہی ہمیشہ استعمال کی جائیں گے چھاپے کے لئے ان میں سے ہر صورت کا ایک الگ ٹھپا ڈھال لیا جائے۔

و اور ہی جب حرف علت ہوں تو ان کی چار چار آوازیں ہوتی ہیں اور جب حرف صیغ ہوں تو ایک ایک آواز یعنی واو کی کل پانچ آوازیں ہوں اور اتنی ہی ہی کی، گریہ یاد رہے کہ ہی کی تین آوازوں میں سے ہر آواز کے لئے دو صورتیں اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ ہی لفظ کے آخر میں پوری لکھی جاتی ہے اور بیچ میں ہو تو ایک شوشے اور نقطوں سے ظاہر کی جاتی ہے۔ پس و اور ہی کی سب ملا کر تیرہ صورتیں ہوتی ہیں، جن کے لئے حسب ذیل حرفوں کا مقرر کرنا مناسب ہوگا:-

حرف علت

واو

جھول : چور، شور، مور، ڈھول، چکور، لاءو، جاءو،

پاؤ بھرائنا، تاو، ناو۔

معروف : دؤر، نؤر، پھول، جھول، دھول، جھاڑو

کھاءو، اڑاؤ۔

ماقبل مضارع : جو، سو، نو، جوڑ، طوڑ، دھوڑ دھپا، کھولنا پانی

مخلوط اور معدولہ : خواب، خواہر، درخواست، خواہش، خواجہ، خود، خوش، خوشپش۔

(تشریح) - (۱) جھول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔

(۲) معروف کے لئے آٹا پیش دیا گیا ہے جیسے مدظلہ کی ہ پر عموماً

دیا جاتا ہے۔

(۳) ماقبل مفتوح کے لئے سیدھا جزم اوپر لگایا گیا ہے
 (۲) مخلوط یعنی جس واو کے بعد آیا سی اے اُس پر الٹا جزم لگایا گیا ہے۔
 معدول واو کے لئے کسی اور نشان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مخلوط او
 معدول واو اُنے گئے فارسی لفظوں میں آتا ہے اور ان میں سے ہر لفظ
 خ سے شروع ہوتا ہے۔

فائدہ۔ الف مدودہ یا یای مدودہ کے بعد اگر و (مجهول) آئے تو اُس کی
 آواز پوری ندر ہے گی؛ جیسے تاو، پاو، ناو، گھاو، پڑاو (اسی
 صورت میں ء کی ضرورت نہیں) اسی طرح سیو، دیو وغیرہ مگر
 جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف مدودہ پر یا یای مدودہ پر ختم ہو جائے
 تو ء کا لکھنا ضروری ہے؛ جیسے آءو، جاءو، وغیرہ [

یای	آخریں	ینچ میں
مجهول	ے	یر : کے، سے، بیر، سیر (وزن)، شیر، ہیر پھیر
معروف	ی	پیر : کی، پانی، پیر، تیر، شیر (دودھ، کھیر، بھیر (مجموع)۔
ماقبل مفتوح	و	یو : ہی، شو، م، شیخ، سیر، سیل، سیلاب
مخلوط		یو : پتیاں، پتیار، تیوری، کیوں، جیوں تیوں

[تشریح (۱) مجهول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔

(۲) معروف کے لئے دونوں نقطوں کے ینچ میں ینچ کی طرف ایک شوشہ
 بڑھایا گیا ہے جیسے خوش نو پس محض خوب صورتی کے لئے یے کے
 نقطوں کے ینچ لگاتے ہیں۔ پس کوئی نامانوس چیز نہیں ہے۔

(۳) ماقبل مفتوح اور مخلوط کے لئے سیدھا اور الٹا جزم اوپر لگایا گیا ہے۔

(۴) آخریں یے کی تین صورتیں (ی، ے اور ی) استعمال ہی ہوتی ہیں ان کی محض پابندی مقصود ہے۔ کوئی نئی تجویز اس امر میں پیش نہیں ہے۔

فائدہ۔ الف مدودہ یا واو مدودہ کے بعد اگر بے (مجمول) آئے تو اُس کی آواز زوری نہ رہے گی! جیسے چاہے، رائے، گائے، نائے، علمائے کرام، اردوئے ثقلیٰ ہوئے گل (ایسی صورت میں ء کی ضرورت نہیں) مگر جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف مدودہ یا واو مدودہ پر ختم ہو جائے تو ء کا لکھنا ضروری ہے جیسے آئے، جائے، جائیے، کھوئے، کھوئیے وغیرہ [

حرفِ صحیح

واوِ صحیح : و : کواڑ ، جواب ، ثواب ، وارث ، وہ ۔
 یاءِ صحیح : یہ : کیا ، دیا ، یاد ، یار ، خیال ، پہ
 نونِ غنہ : ن : تہ : کہاں ، یہاں ، ہنسنّا ، ہنسن گیا۔
 ہائے ملفوظ : ہ ، ہہ : بٹیاہ ، بٹیاہ ، چاہ ، راہ ، کلاہ ، سیہ بخت
 مملوٹ : مھ : بھاو ، گھاو ، پھیر ، دھاوا ، کرٹھائی
 مختفی : ہ ، سہ : پردہ ، زردہ ، بندہ ، مورچہ ، درجہ۔

یہ بھی وہی پڑانی باتیں ہیں۔ بس ان پر عمل پابندی کے ساتھ ہو۔

عام طور پر تمام کتابوں کی اور اخباروں وغیرہ کی چھپائی میں اوپر کے گیارہ قاعدوں کی پابندی کی جائے تو کافی ہے۔

البتہ جو کتابیں مبتدیوں کے لئے ہوں یا جولفت کے فن پر ہوں ان میں ان قاعدوں کی پابندی کے علاوہ جہاں جہاں ضرورت ہو زیر اور پیش کا نشان بھی لگایا جائے۔
 واو اور یے کی مختلف آوازوں کے لئے الگ الگ حرفوں کے مقرر کر لینے کا ایک بڑا فائدہ

یہ کہ اُن سے قبل جو حرف آئیں وہ اعراب سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں؛ جیسے ”وہ بھی کبھی جرّت کبھی سُودا“ کبھی مہر کے انداز میں غزل لکھتے تھے مگر اخیر میں خواجہ میر درد کی طرز میں آگے گئے تھے۔ اس عبارت میں ”بھی“ کا لفظ اس لئے اعراب سے مستثنیٰ ہوا کہ یہ کی جوشگل لکھی گئی ہے وہ معروف ہے اور اُس سے پہلے کا حرف اُس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ یہی حال ”کے“، ”تھے“، ”کی“ کا ہے۔ ”کبھی“ پر اعراب کی اس لئے ضرورت نہیں کہ ک مفتوح ہے اور بھ کا حرف علت سی ہے جس کا معروف ہونا اُس کی شکل سے ظاہر ہے۔ ”سودا“ میں س کو و اور د کو آ اعراب سے مستثنیٰ کرتا ہے۔ ”مہر“ کے دونوں حرفِ صیح اس لئے اعراب کو نہیں چاہتے کہ پہلے کے بعد حرفِ علت منکّل ہے اور دوسرا، لفظ کا اخیر حرف اور اس لئے ساکن اور جزم کے نشان سے مستثنیٰ ہے۔ اب ذیل کی عبارتوں کو لو:-

- ۱۔ آء و جلیں، شب بؤ کی بھنی خوش بؤ کو سونگھیں، تم بھی سونگھو، میں بھی سونگھوں۔
- ۲۔ بے چارے غوپ آدمی کے لئے جو کی سونگھی روٹی پلاؤ زردے کا حکم رکھتی ہے۔
- ۳۔ چمپد نے تھوڑی سی سپر کی تھی اُس میں نو سو سیر جو پیدا ہوا، سارے گھرنے پورے سال بھر خوب پیٹ بھر کے کھاپا اور میں رُپے کا غلہ بیچ لیا سو الگ۔ جو میں تو اتنا فائدہ ہوا مگر جوار جو اُس بچارے نے بوائے تھی ساری کی ساری پانی میں گل گئی کہ دوسری فصل میں بیج ڈالنے تک کو ایک دانہ پیسٹر نہ آیا۔

۴۔ وہ صُح کو آءے تو کروں باتوں میں دو پہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا دھل جائے تو اچھا ذوق

(۱) تم۔ (۲) پلاؤ، حکم (۳) رُپے، لپا، فائدہ، بچارے، پیسٹر (۴) صُح، ون۔ ۱۱ میں یہ دس لفظ ہیں جن میں صرف ایک ایک حرفِ اعراب کے نشان کا محتاج رہا باقی تمام حرف اُن کی بارہ قاعدوں کی پابندی سے کسی مزید اعراب کے محتاج نہیں رہے۔

بے اعراب کی

معمولی چھپی ہوئی عبارت

اعراب والی عبارت

مبتدئوں کے پڑھنے کے لیے

بھائی، جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن
ہر دیو سنگھ کی غرضی اور پیس، روپے کی
رہبر اور پان سو کی ہندوی پہنچی۔ تم سمجھے باؤ صاحب
صاحب نے پیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیے
اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہندوی بارہ
دن کی سیادی تھی، چھ دن گزر گئے تھے، چھ دن
باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ مٹی کاٹ کر روپے
لے لے، قرض متفرق سب ادا ہو، بہت
سبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس ملحقہ نقد
کس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب
کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ احمَدُ اللہ علی
احسانہ۔ بھائی صاحب آگئے ہوں تو میر
قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اور میرا
سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں اُن کو خط لکھوں
باؤ صاحب بھرت پور آجائیں تو آپ کا ہلی نہ
کیجیے گا اور اُن کے پاس جائے پے گا کہ وہ تمہارے
جو پائے دیدار ہیں۔

غالب (اُر دوئے معلیٰ)

بھائی، جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن
ہر دیو سنگھ کی غرضی اور پیس روپے کی
رہبر اور پان سو کی ہندوی پہنچی۔ تم سمجھے باؤ صاحب
صاحب نے پیس روپے ہر دیو سنگھ کو دیے
اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہندوی بارہ
دن کی سیادی تھی، چھ دن گزر گئے تھے، چھ دن
باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ مٹی کاٹ کر
روپے لے لے، قرض متفرق سب ادا ہو، بہت
سبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس ملحقہ نقد
کس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب
کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ احمَدُ اللہ علی
احسانہ۔ بھائی صاحب آگئے ہوں تو میر
قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اور میرا
سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں اُن کو خط
لکھوں۔ باؤ صاحب بھرت پور آجائیں تو آپ کا ہلی
نہ کیجیے گا اور اُن کے پاس جائے پے گا کہ وہ تمہارے
جو پائے دیدار ہیں۔

غالب (اُر دوئے معلیٰ)

بے اعراب کی عبارت

ہنوز اک پرتو نقش خیال پار باقی ہے:
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہی یوسف کے زندان کا۔

(غالب)

محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہاے راز کا
پاں، ورنہ، جو حجاب ہی پردہ ہی ساز کا۔

(غالب)

منہہ سکا ہی کرے ہی جس تس کا

حیرتی ہی یہ آئینہ کس کا ؟

(میر)

عشق بے ہی خیال پڑا ہی، چین گیا، آرام گیا؛
جی کا جانا ٹھیر گیا ہی: صبح گیا یا شام گیا۔

(میر)

اد پر کی عبارت دو طرح پر لکھی گئی ہے: پورے اعراب کے ساتھ بھی اور ادھورے اعراب کے ساتھ بھی اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ جو قاعدے کتابت کے بیان ہو چکے ہیں ان پر عمل کیا جائے تو بہت تھوڑے نشان لگانے سے عبارت کی تشکیل ہو جاتی ہے یعنی تلبیس نہیں رہتی اور چون کہ اعراب بہت گھٹ گئے ہیں اور واو، یے وغیرہ حرفوں کی مختلف آوازوں میں سے ہر ایک نے ایک مستقل حرف کی صورت اختیار کر کے اپنے ماقبل حرف کو اعراب سے مستغنی کر دیا ہے اور پھر امکان بھر ایک ایک لفظ الگ لکھا گیا ہے اس لئے لوہے کے چھاپے میں بھی کما حقہ آسانی ہو گی۔

آخر میں مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ بعض لفظ ضروریہ میں جن کو ہم مجوزہ قاعدوں کے مطابق نہیں لکھ سکے۔ جیسے ”ہونا“ کا ماضی مطلق ”ہوا“، ”ہوئی“ اگر ان دونوں لفظوں کو قاعدے کے

اعراب والی عبارت

ہنوز اک پرتو نقش خیال پار باقی ہے:
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہی یوسف کے زندان کا۔

(غالب)

محرم نہیں ہی تو ہی نوا ہاے راز کا؛
پاں، ورنہ، جو حجاب ہی پردہ ہی ساز کا

(غالب)

منہہ سکا ہی کرے ہی جس تس کا؛

حیرتی ہی یہ آئینہ کس کا ؟

(میر)

عشق بے ہی خیال پڑا ہی، چین گیا، آرام گیا؛
جی کا جانا ٹھیر گیا ہی: صبح گیا یا شام گیا۔

(میر)

مطابق لکھے تو یوں ہوں گے، ”ہٹنا“، ”ہٹی“ یہ مروج شکل سے بہت دور پڑ جاتے ہیں اور سچ پوچھو تو صوت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔ پس اس خاص صورت میں کہ ہم کو ایک ایسی آواز کو کتابت میں لانا ہو جو ”و“ اور ”ع“ کے بین بین ہو، بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتابت یوں کی جائے: ”ہو، و،“ ”ہو، عی“ اسی طرح بعض لفظوں میں ”و“ لکھا جائے مگر اُس کی آواز خفیف ہوگی جیسے ”کان پور“ اس کا فصیح تلفظ ”کان پور“ ہے پس ایسی صورتوں میں بہتر یہی ہے کہ لفظ کی اصل کا لحاظ کر کے اُس کی کتابت کی جائے یعنی ”کان پور“، ”شاہ جہاں پور“ گو کہ اُس کا تلفظ ”— پور“ کیا جائے۔

نتیجہ تھپے کے بنانے میں جو دقیق ہیں اُن کا جو حل میرے ذہن میں ہو اُسے میں کسی دوسرے موقع پر بیان کروں گا۔



کلام و تاج

(جناب و تاج الدین حیدر صاحب تاج جو آج کل ریاست بھوپال میں ایک منصب جلیلہ پر مامور ہیں اردو کے بڑے قادر الکلام شاعریں حضرت و تاج کو زمانہ طالب علمی سے شعر و شاعری کا لہکا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خوب کہتے ہیں۔ اُن کے کلام میں صفائی، شیرینی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ اپنے ایک خط اپنے دوست مولوی محمد حسین صاحب مخوی کو لکھا ہے جس میں اپنی چند مختصر نظمیں بھی درج فرمادی ہیں۔ یں نظمیں بہت قابل قدر ہیں اور یقین ہے کہ ناظرین لطف حاصل کریں گے۔ اڈیٹر)

... نسیم باغ کا آنا اور گل و سنبل سے اٹھکیلیاں کرنا، قآآنی نے اپنا حصہ کر لیا ہے میں نے آپ کی اُردو میں اُسی نمونہ کے مطابق، جس کا ذکر آپ سے کیا تھا۔ جو کچھ لکھا ہے وہ حسب فرمائش لکھتا ہوں۔ مولانا عبدالحی صاحب کو بھی سنائیے گا۔ اس نمونہ کے متعلق جو نوٹ لکھا تھا وہ بھی منقول ہے۔

نوٹ: اکثر کہا جاتا ہے کہ جو موقع اظہار جذبات کا اور اُن کے اثرات کا بہاشا میں ہے، وہ اُردو میں بھی فارسی کی طرح نہیں ہوتا۔

اقتباس نہ و تاج | یہ بحث کہ فارسی اور اُردو نیز عربی بلکہ دیگر مشرقی و مغربی زبانوں کی شاعری میں یہ موقع اور اثر کس قدر ہے، طویل اور محتاج تفصیل ہے۔ اُردو زبان کے متعلق صرف یہ تسلیم کرنا لازمی ہے کہ فارسی کی طرح کی اس میں بھی عورتوں کی طرف سے خطاب نہیں کیا جاتا اور جو اثر بجا طرز اکت بیان و انداز تقریر عورتوں کی زبان میں ہے۔ اُس کا مقابلہ مردوں کی زبان اور طرز بیان سے نہیں ہو سکتا۔ مگر غور کرنے سے ظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح نثر اُردو میں عورتوں کی زبان میں بالفاظ اُردو اظہار جذبات اور خیالات کا اندازہ کامیابی کے ساتھ ہو چکا ہے۔ نظم میں بھی ممکن العمل ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف نظم پر مثل دیگر اصناف کے ہنوز تو ہم نہیں کی گئی ہے۔ (ریختی کی افسوس ناک مثال خارج از بحث ہے) بالفضل میں اسی خیال کی تمثیل میں بغیر عمدہ تکمیل

چند نمونے پیش کرتا ہوں جن میں گو عورتوں کی طرف سے بہ تمام و کمال التزام نہیں ہے۔ نہ یہ اُردو میں بہ حالت موجودہ مستحسن معلوم ہوتا ہے لیکن بعض لوازم موجودہ ہیں۔ مثلاً حتی الامکان اُردو اور بہا شا کے الفاظ جو اُردو میں جوازاً مستعمل ہیں۔ اُن کی تلاش کی جائے اور فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ نیز ترکیبات اصنافی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ غزل تو آپ سن ہی چکے ہیں جس کے دو شعر لکھتا ہوں: ۵

کیسی ادا سے آبیٹھی دل میں لے لوں بلائیں میں پیاری نظر کی
طور کو پھو کا جس کی لیک نے تھی وہ تجھ سی تھاری نظر کی
صبح بار بھی آپ سن چکے ہیں۔ اس کے بھی چند شعر لکھے جاتے ہیں:

کیا صبح ہی سہانی	پہنے ہی جوڑا دھانی
سبزے میں کیا لہک	پھولوں میں کیا تھک
دلہن بنی ہر کیاری	جون پہ ہی پھلاری
پیڑوں نے زیور پہنا	بھاری ہی کیا کیا گنا
سبیل نے گیسو کھوئے	شبنم نے موتی روئے
کلیاں چمک رہی ہیں	پڑیاں چمک رہی ہیں
کیا گل ہی کیا گل کاری	کیا شان ہی میں واری
بیلا، پھیلی، جو ہی	ہر پھول میں ہی تو ہی
گل پر فدا ہی صُبل	تجھ پر صدقے ہر گل

قآنی کا فارسی عبد حسب ذیل ہے:-

نرمک نرمک نسیم، زیرِ گلاں می خزد	غلبہ ایں می کد، عارضِ آں می مزد
سبیل ایں می کشد، گردِ دینِ آں می گزد	گہ کجمن می چمد، گہ بسمن می وزد

گاہ بشارخ درخت، گہ بلبل جو بہار

اُردو میں اس طرح تصویر کھینچی گئی ہے:

(۱)

دھیمی دھیمی نسیم، سبزہ پہ سوتی ہوئی سوکے اٹھی ہو تو منہ ، اوس سے دھوتی ہوئی
نہروں پہ لہراگئی ، لہروں سے ٹکراگئی کیاریوں پر چھاگئی ، پیڑوں پہ منڈلاگئی

(۲)

سرو نے لیٹا لیا ، کٹ گئی شہراگئی مڑ گئی کتراگئی ، کپ گئی تھسراگئی
رک گئی ، گھبراگئی ، جھک گئی دہراگئی اُس کو بھی بل دیدیا آپ بھی بل کھاگئی

(۳)

ہلکی ہلکی نسیم، شاخوں میں پستی ہوئی کلیوں سے ہنستی ہوئی ، پھولوں میں بستی ہوئی
چوس لئے ان کے ہونٹ ، چوم لیا ان کا منہ کلیوں سے اٹھلاگئی ، پھولوں سے اتر گئی

(۴)

بھینی بھینی نسیم! تو نے کھلائی بہار جھوم کے مستوں کی طح دھوم سے آئی بہار
باغ سے فردوس کے ، بن کے وطن آگئی چھوڑ کے پردیس کو اپنے وطن آگئی

وہاج الدین حیدر (بھوپال)

بیرسٹریٹ لا

اصلاح اُردو

(جناب سید الطاف حسین صاحب کاظم)

ماہ اپریل کے رسالہ اُردو جلد سوم حصہ دہم میں دو اور مضامین اصلاح رسم خط کے متعلق دیکھے گئے۔ جن میں متعدد و مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ علت غائی ان تمام مضامین کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اُردو رسم خط رومن کیرکٹر یا دیوناگری کے برابر سہل ہو جائے، لیکن اس دعا کے لئے ہماری تجنیں نسبتاً زیادہ باقاعدہ ہونی چاہیں یعنی اول ان تمام تغیرات کو قلب بند کر لیا جائے جن سے ہم مطلوبہ نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر دفعات ایک ایک بات پر بحث کی جائے ہر بحث میں فریقین کو یہ اصول پیش نظر رکھنا لازم ہوگا کہ اگر ہم گزشتہ دور کی تحقیقات کو یک قلم باطل سمجھ لیں تو یہاں تک انیس پہنچ سکتے اور سب کو آنکھ بند کر کے صحیح تسلیم کر لیں تو آگے نہیں بڑھ سکتے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اول اردو کتابت کو صحت و سہولت میں دیوناگری کی برابر بنایا جائے اس کے بعد برتری کی کوشش کی جائے اس لئے اوقاف و اعجام کی بحث ابھی قبل از وقت ہے۔

اصلاح رسم خط میں اہم بات یہ ہے کہ متحد الصوت حروف بھی خارج کر دیئے جائیں اور لکھنے میں محض تلفظ کی پابندی کی جائے تو بھی اردو حروف تہجی کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ رومن کیرکٹر کی برابر اس وقت بھی سہولت پیدا نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک عین عہد میں اور شکل کا ہی تعبیر میں اور وضع کا اور نزاع میں اور صورت کا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ دیوناگری کو اس شترگرگی کی ہوا بھی نہیں لگی۔

لہذا

ان چند در چند خیالات کی بنا پر جو مسائل بظاہر قابلِ غور معلوم ہوتے ہیں ایک جگہ لکھ کر ہم اپنے خیالات مختصراً

لے یہ مضمون مجلس کے فیصلے کے بعد موصول ہوا چونکہ اس میں بعض اور امور پر بھی بحث ہے لہذا درج کیا جاتا ہے (ادنیٰ)

پیش کئے دیتے ہیں، اختلافی دلائل کے جواب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔ اختلاف کی صورت میں ایک ہی مسئلہ زیر بحث آنا چاہیے، اور جن جن شقوں سے اتفاق ہو وہ سب ایک دفعہ ہی لکھ دیئے جائیں تاکہ مباحث جلد کسی منفی یا مثبت نتیجے پر پہنچ جائیں۔

۱۔ حروف تہجی کی ترمیم

(۱) حروف ثقیلہ اور حروف غنہ بڑھائے جائیں۔

(۲) حروف متحد الصوت خارج کرو دیئے جائیں۔

(۳) دو یا تریں سے ایک رکھی جائے۔

(۴) ثر کو بھی خارج کیا جائے۔

(۵) اقسام و خواص۔

۲۔ رسم خط کی اصلاح

(۱) اقسام واو

(۲) اقسام یاء

(۳) مرکبات

۳۔ تلفظ کی پابندی

(۱) حروفِ مغیرہ کا اثر۔

(۲) تنوین۔

(۳) آل انسانی۔

(۴) عیسیٰ موسیٰ وغیرہ الفاظ

(۵) گنبد۔ دُنبہ ۛ ۛ

(۶) واو معدولہ

۴۔ بعض حروف کی رسم خط

(۱) حروف تہجی ہر زبان کے جزو لائتجزی۔ عنصر یا مفرد آوازیں ہیں۔ ہر مفرد آواز کے لئے ایک شکل یا نشان مقرر کر کے اُس کا نام رکھ لیا گیا ہے، اس لئے حروف تہجی میں ایک آواز کے لئے دو شکلیں یا دو آوازیں کے لئے ایک شکل ہو تو نقص میں داخل ہے۔ یا سب سے بعض آوازیں ہی نہ ہوں تو وہ حروف تہجی مکمل نہیں۔ یہ ایک سادہ عقلی اصول ہے۔

۱۔ اردو حروف تہجی کو دیکھئے تو وہ کسی طرح اس معیار پر کھربے نہیں آتے اس میں ز، ذ، ض، ظ وغیرہ ایک آواز کی چند شکلیں بھی موجود ہیں اور بہت سی آوازوں کی شکلیں موجود بھی نہیں تھیں۔ چنانچہ کل کی بات ہے۔ ایک آواز کے لئے دو نشان ملا کر کام نکالا جاتا تھا اور کٹھا کے بچے کہ ۱۰ زبر کھائے جاتے تھے۔ جو کسی طرح صحیح نہیں سمجھے جاسکتے۔ اس وقت کو پنجاب یونیورسٹی نے حروف تہجی میں حروف ثقیلہ بڑھا کر رفع کر دیا اور تعصب کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کیا جائے تو کتنا پڑے گا کہ بہت اچھا کیا اور اردو پر احسان کیا۔ لیکن جس قدر ثقیل آوازیں تھیں اول تو وہ بھی پوری نہیں بڑھائی تھیں۔ دوسرے اُن سے زیادہ غننی آوازیں سب کی سب باقی رہ گئی تھیں جو کثرت سے ہمارے روزمرہ میں آتی ہیں چنانچہ جس طرح کھیل، کھلونا کے صحیح تہجی بغیر حروف ثقیلہ کے نہیں ہو سکتے اسی طرح ہنسی اور ہنسنے کے بغیر حروف غنہ کے ممکن نہیں ہیں اس لئے ہم نے اپنے جدید قاعدہ اردو میں حروف غنہ بڑھا دیے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس کے لئے کسی دقیق فلسفیانہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک ضمنی مگر اہم فائدہ ان سے یہ پہنچتا ہے کہ ترکیب الفاظ میں حروف کی جو شکلیں بدل جاتی ہیں اُن سے بچہ حروف تہجی میں ہی واقف ہو جاتا ہے۔ اور بہت جلد چل نکلتا ہے۔ المختصر ہمارے نزدیک جب تک حروف غنہ نہ بڑھائے جائیں گے اردو حروف تہجی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ متحد الصوت حروف کا اخراج بظاہر ایک بڑا معاملہ معلوم ہوتا ہے مگر جب کہ ان اشکال و حروف پر نہ اسلام کا دار و مدار ہے نہ مسلمانوں کی قومیت کا انحصار تو یہ چنداں پس و پیش کا معاملہ معلوم نہیں ہوتا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایک یقینی و نقد فائدہ بھی نظر آتا ہے ان حروف کا سب سے بڑا فائدہ موجودہ حالت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر لفظ اپنا تجربہ نسب ساتھ رکھتا ہے اور فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کا مادہ کیا ہے اور

حروف قدیمہ بھی کئی قسموں میں منقسم ہو سکتے ہیں مثلاً :

۱- حروف علت آ و ی

ب- ناقصہ ر ے ن جن سے کوئی لفظ کبھی شروع نہیں ہوتا۔

ج- منفصل جو لفظ کے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور ملا کر نہیں لکھے جاتے مثلاً آ ر ذ و ز و ط

د- متصل مثلاً ج ب ن وغیرہ جو اول و آخر لفظ کے ہر حصے میں ملا کر لکھے جاتے ہیں

۴- یہ کلیہ ہے کہ حروف غنہ ساکن یا موقوف صورت میں کبھی نہیں آتے ہمیشہ صرف متحرک ہوتے ہیں۔

(۲) رسم خط۔

۱- واو تین طرح کی ہوتی ہے۔ واو تہجول، جس کے ماقبل حرف پر غیر جنس حرکت ہو۔ جیسے کو کے

لام پر زبر۔ دوسری واو معروف جس کے ماقبل پر حرکت ہم جنس یا پیش ہو۔ جیسے کو۔ تیسری واو متوسط

جس پر کوئی حرکت نہ ہو ہم جنس نہ غیر جنس۔ اس کی آواز دونوں واووں کے بین بن ہوتی ہے جیسے لو

۲- واو کی طرح یا ر کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ حرکت ہم جنس اور غیر جنس کے لحاظ سے آوازیں تبدیل

ہوتی ہیں۔ یہ امر تقریباً طے شدہ ہے کہ واو اور یا متوسط کے ماقبل پر کوئی حرکت ہم جنس یا غیر جنس

نہیں ہوتی۔

۳- واو اور یا ر کے علاوہ مرکب الفاظ میں مولوی سید ہاشمی صاحب کی رائے کے بموجب جو

اجزاء لفظ ترمیم ہو کر مستقل لفظ نہیں رہے وہ ملا کر لکھنے چاہئیں۔ اور جو اجزاء اصلی حالت میں باہمی

لفظ ہیں ان کو جدا جدا لکھنا مناسب ہے جیسے ٹپکھٹ اور کام چور

(۳) تلفظ کی پابندی

۱- حروف میغزہ کا اثر! اس میں پروفیسر نعیم الرحمن صاحب کی رائے قابل تسلیم ہے کہ جن الفاظ

کے آخر میں ہار فختی سے پہلے ع ہو تو ہار فختی کو یا ر سے بدل دینا چاہیے۔ مگر جب ع حروف تہجی سے

خارج ہو جائے گا، تو الف یا ر سے بدلا جائے گا۔

۲- تنوین کی جگہ بھی نوٹ لکھا جانا مناسب ہے چنانچہ فوراً سے فوراً لکھا جائے گا۔

۳۔ آل اضافی کو اڑا کر تلفظ کی پابندی سے صرف لام ساکن لکھا جائے اور اس کا ماقبل مضموم ہو۔ جیسے عبد لکرم۔

۴۔ عیسیٰ۔ موسیٰ الفاظ میں یار کی جگہ الف لکھا جائے گا۔

۵۔ گنبد، دنبہ میں صاف میم ہی۔ یہی لکھا جائے۔

۶۔ واو معدولہ کو معدوم کر دیا جائے اور سید سے طور سے خاب، کمخاب، خُراک لکھنا مناسب ہوگا۔



تجربے

ادب

۱۔ علی گڑھ کے مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے غالب کے اردو کلام کو نہایت آب و تاب سے شائع کر کے اردو بولنے والی قوم پر ایک بڑا احسان کیا ہے

اچھی چھپائی اور اتنی خوبصورت جلد میں کسی اردو شاعر کا دیوان اب تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ کتاب شہر میں (جہانپور) کے مشہور ایرانی چھاپے خانے ”مطبع کاویانی“ میں دو رنگوں میں چھاپی گئی ہے۔ سپاہِ متن کے گرد سرخ جدول بہت بھلی معلوم ہوتی ہے شاعر کا تخلص جا بجا سرخ حرفوں میں نمایاں ہے تقطیع صبی ہے اس لئے ہر صفحہ پر زیادہ سے زیادہ چودہ مصرعے آئے ہیں۔ کتاب کی لوح کے مقابل غالب کی رنگین تصویر لگی ہے جو جرمانی رنگ آمیزی اور چھپائی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب کی جلد کپڑے کی ہو جس پر سنہرا کام اور اس کے بیچ میں سیاہ نستعلیق حرفوں میں کتاب کا نام بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ پشتے پر اوپر کی جانب ایک سیاہ چمچی پر ہمیں سنہرے نستعلیق خط میں کتاب کا نام بڑے سلیقہ سے چھاپا گیا ہے۔

۲۔ چونکہ کتاب نسخہ چھپے کے حرفوں میں چھپی ہے اس لئے لمبی سے کہیں نہیں دکھائی دیتی مگر معروف سی کے نیچے دو نقطے لگا کر اسے ممتاز کر دیا ہو اور ٹ ڈ پر بجائے ط کے چار نقطے سلیقے سے لگا دیں جو ہرگز بڑے معلوم نہیں ہوتے۔

۳۔ الغرض غالب کا یہ نسخہ ظاہری خوبیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے اس لحاظ سے قیمت بھی بہت کم ہے یعنی صرف (۱۰)۔

۴۔ افسوس صرف اس قدر ہے کہ صحت کا کافی انتظام نہیں کیا گیا۔ بعض جگہ کوئی حرف پھینک دیا گیا

مثلاً ص ۳۱ س ۲ (نیچے سے) ص ۴۱ س ۱ (نیچے سے) ص ۱۹۷ س ۹
 ص ۲۰۱ س ۴ (نیچے سے) ص ۲۴۸ س ۵ (نیچے سے) ص ۲۷۲ س ۴ (نیچے سے) کہیں کوئی پورا لفظ غائب ہے
 جیسے ص ۲۳۲ س ۶ کے شروع اور ص ۲۶۹ س ۱۱ کے آخر سے ”غالب“۔

۵۔ چند اور غلطیاں بھی نظر پڑیں جن کی تصحیح یہاں کی جاتی ہے :- ص ۹۷ س ۷۔ ”سوئے ہیں“ کی جگہ
 ”سوئے ہیں“ چاہئے ص ۳۱ س ۴۔ ”نہ“ کے بجائے ”نہ“ چاہئے۔ ص ۱۱۵ س ۱۱ ”کسی کی خواب“ کی جگہ ”کسی کے
 خواب چاہئے“ ص ۱۱۹ س ۱۱ ”ہو“ کی جگہ ”کہ“ چاہئے اور پورا مصرعہ یوں لکھا جائے: بتاؤ اس مژدہ کو دیکھ کر کہ
 مجھ کو قرار ص ۱۲۱ س ۵ (نیچے سے) ”ہوا“ کی جگہ ”ہو“ چاہئے ص ۱۲۸ س ۱۰ ”ٹھنڈا“ کی جگہ ”ٹھنڈا چاہئے
 ص ۱۸۷ س ۷ ”سمجھ کہ“ کی جگہ ”سمجھ کے“ ہونا چاہئے۔ ص ۲۰۷ س ۷ ”غالب“ مصرعے میں سماتا نہیں
 ”امد“ چاہئے ص ۲۳۷ س ۹ ”تیرا گزر“ کی جگہ ”تیرا گزر چاہئے“ ص ۲۶۶ س ۲ ”اب کے سال“ اور ”اب کے
 بار“ چاہئے۔ ص ۲۷۲ س ۲ ”فسردہ“ کی جگہ ”فسردہ“ چاہئے۔

۶۔ کہیں کہیں وقف کے نشان لگائے گئے ہیں لیکن اس میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔
 جہاں ضرورت تھی وہاں اکثر نشان نہیں لگائے گئے اور بعض جگہ غلط نشان لگے ہیں۔ مثال کے طور
 پر چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ص ۳۸ س ۷ ”لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں“ لگاؤ“ ص ۱۱۸ س ۱۰ ”کے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو“ تو کیوں
 ہو“ ص ۱۲۸ س ۴ جس میں کہ ایک بیضہ آموں آسمان ہو“ ص ۱۶۴ س ۷ ”اور اگر ہو بھی؟“ ص ۱۷۵ س ۲
 ”دل بھی یارب کئی دئے ہوتے“ ص ۱۶۶ س ۲ ”دامی؟“

پہلی مثال میں سکتے کا نشان سمجھیں“ کے بعد نہیں لگا ”لاگ ہو“ کے بعد اور دوسری مثال میں ”نہ ہوا“
 کے بعد ہونا چاہئے تھا۔ تیسری میں سکتے کا اور چوتھی میں استفہام کا نشان ہونا ہی نہ چاہئے تھا۔ پانچویں
 اور چھٹی مثال میں استفہام کے نشان کی جگہ خطاب کا نشان (!) چاہئے تھا۔ ذیل میں بعض مثالیں درج کی
 جاتی ہیں اگر ان میں ایک آدھ جگہ وقف کے نشان ہوتے تو متن کے پڑھنے والے کو بڑی آسانی ہو جاتی۔
 جو نشان تو سین کے اندر نظر آتے ہیں وہ میری تجویز ہے۔

ص ۴۶ س ۵ ”جو ہوا غرقہ“ [۱] بخت رسا رکھتا ہے“ ص ۱۰۱ س ۲ (نیچے سے) سب (۱) قیوبو سے ہوں ناخوش (۱) پر زمان مصر سے ہے زینا خوش کہ جو ماہ کھاں ہو گئیں“
ص ۱۹ پر پہلے اور پانچویں شعر کے علاوہ بھی ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں ”تو کیوں کر ہو“ سے پہلے سکتے کا نشان ہوتا تو بہتر تھا۔

ص ۴۸ س ۲ (نیچے سے) ”کروں بے داؤد ذوقِ پرفشا فی عرض (۱) کیا قدرت؟“ ص ۲۰۸ س ۷۔
”تکلف بر طرف (۱) ہے جاں ستاں تر لطیف بدخوایاں“ ص ۲۳۵ س ۷ ”کون ہے (۱) جس کے در پناہ صیہ“
ص ۲۵۸ س ۹ ”تار ریشم کا نہیں (۱) ہی یہ رگ ابر بہار“

۷۔ الف پر زیر پائش کہیں نہیں لگایا گیا جس سے اس اور اس میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہمزہ کی کتابت بالکل بے اصول ہے ”سخت جانی ہائے“ ”جوئے شیر“ ”بزدے کار“ ”تسخہ ہائے وفا“ ”ذریائے خوں“ ”خندے پائے خزاں“ وغیرہ میں ہمزہ نہ لکھنا چاہئے۔ اسی طرح تو بے گل کی جگہ ”بونی گل“ اور پائے ثبات کی جگہ ”پائی ثبات“ اور ص ۱۲۸ پر اخیر سطر میں ”فرماں رولے کی جگہ“ ”فرماں روائی“ لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے یا در ہے کہ کسرۂ اضافت کا بدل ہمزہ بھی ہے اور جی بھی پس ایک اضافت کے لئے ہمزہ اور جی دونوں لکھنا درست نہیں ہو سکتا۔ محقق ہ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد ہمزہ سے اور آیا و پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد جی سے اضافت کو ظاہر کرنا چاہئے۔ بے شک عام طور پر اضافت کی کتابت میں بڑی بد نظمی پھیلی ہوئی ہے مگر دیوان غالب کے دیر تبصرہ نسخے کے ترتیب دینے والوں کو اس بد نظمی میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور بھی جگہ ہمزہ بے محل لکھا گیا ہے مثلاً ص ۱۸ ”ذبیہ دول“ (یعنی ”ذبیہ دول“) ص ۱۰۱ س ۱ ”ذبیہ دول“ (یعنی ”ذبیہ دول“) ص ۱۰۱ س ۱ ”ذبیہ دول“ (یعنی ”ذبیہ دول“)۔
۸۔ ایک دوسری بد نظمی اردو کی کتابت میں یہ بہت عام ہے کہ جس جگہ پر سے بولتے وہاں بھی وہ لکھتے ہیں جیسے ”بندہ نے کہا“ ”پردہ کے پیچھے“ وغیرہ۔ غالب کے اس نئے نسخے میں عموماً ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ مگر کہیں کہیں غلط رسم خط اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱ س ۳ (نیچے سے) ”بت کدہ کا در“ ص ۳۶ س ۳ ”رنجیہ کے“ ص ۱۳ ”بت خانہ“ میں ”ص ۱۳ س ۷“ ”شعلہ میں“ ص ۲۰۶ س ۵ ”کعبہ سے“ اور س ۷ ”مے خانہ کا“ ”حال آں کہ ہونا چاہئے تھا“ ”بت کدہ کا در“ ”رنجیہ کے“ ”بت خانہ میں“ ”شعلہ میں“ ”کعبہ سے“ ”مے خانہ کا“ ص ۵۱ پر اس

شعریں "آئینہ" کے بجائے "آئینے" لکھنا نہایت ضروری ہو: ہوئے اس مردوش کے جلوہ شمال کے آگے۔
پرافشاں جو ہر آئینے میں مثل ذرہ روزن میں۔

۹۔ لفظوں کو الگ لکھنے کی کوشش کی گئی ہو، لیکن بعض جگہ نہایت بے پروائی کے ساتھ دو ایسے لفظوں کو ملا کر لکھ دیا ہے جن کا ملانا غلط ہی جیسے "اسقدر"، "رضوالکا"، "رضوانسے"، "نسیانکا"، "بشمنانکا" "تسہنگی" اسی طرح بعض جگہوں پر دو لفظوں یا ایک ہی لفظ کے ٹکڑوں میں غلط فاصلہ دے دیا ہو جس سے پڑھنے والے کو اکثر دھوکا ہوتا ہے "جیسے" "شکل پسند آیا" کی جگہ "شکل پسند آیا" لکھ دیا ہے۔ یا ص ۲۳۶ اس اخیر گو درز لکھنے کے عوض "گو درز" لکھا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ "رہو"، "کیو" وغیرہ کی سی پر تشدید کس قاعدے سے لگائی گئی۔ شاید غلطی بدایوں کے چھپے ہوئے نسخے سے انداز کی گئی ہو۔

۱۱۔ "تماشا" کا اطلاق عموماً صحیح لکھا گیا ہے لیکن دو ایک جگہ غلط اطلاق "تماشہ" بھی نظر پڑا (ص ۲۳۸) یاد رکھنے کی بات ہو کہ عربی لفظوں میں تماشا، تماشا وغیرہ اور فارسی ترکی لفظوں میں تما، اچلیا، ناشا وغیرہ الف سحر صحیح اور ہ سے غلط ہیں۔ بعض حضرات تو سمجھتے ہیں کہ "استفا" کو "استغنی" لکھتے اور اسی کو عربی صرف کے مطابق سمجھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ عربی میں "استعفاء" (استفعال کے وزن پر) ہو۔ اور طالب کی جمع یاروں نے طلباء بنا رکھی ہو حالانکہ عربی میں "طلبہ" ہے۔

۱۲۔ ص ۱۷۲ اس "باربد" کی دوسری باب پر خاص اہتمام سے پیش لگا یا گیا ہو۔ لیکن یہ درست نہیں بلکہ صحیح لفظ "باربد" ہو فارسی میں کئی لفظ ایسے ہیں جن پر لائقہ بد (یعنی صاحب) داخل ہوا ہو جیسے توبہ چہرہ بد، باربد قدیم فارسی زبان میں یہ لفظ پت تھا (منکر پت)

۱۳۔ غالب کے دیوان کے قابل الطینان نسخوں کے متن سے اس متن میں بعض ایسے اختلافات نظر پڑے جن پر مجھے نہایت تعجب ہوا اور جن کا حل سو اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ شاعر کو اصلاح دینے کی کوشش کی گئی ہو۔ مگر یہ بات تبصیح کے ممول کے بالکل خلاف ہو۔ صحیح کو متن میں تغیر تبدیل کرنے کا ہرگز اختیار نہیں ہو البتہ اگر مختلف نسخوں کی قرات مختلف ہو تو وہ ایک کو ترجیح دے سکتا ہو یا اگر سب قراتیں ایسی ہوں کہ معنی بنتے ہی نہ ہوں تو پہلے قیاس ہو ایک نیا لفظ

متن میں داخل کرے لیکن اس کی اطلاع ضرور کرے افسوس ہو کہ غیر محتاط مصحح یا شراح اس ہول کی پروا نہیں کرتے چنانچہ مولوی ابوالحسن صاحب بدایونی نے حافظ کے کلام میں سینکڑوں تصرف کئے ہیں فرماتے ہیں کہ:-

”وگر کم طبع نسیم بوسہ صد افسوس

زحقہ و ہنش چوں شکر فردریزد

”میں“ افسوس” سہو کاتب ہو“ دشنام“ ہونا چاہئے“ لیکن اگر وہ کسی فارسی لغت کی کتاب کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً ایسے دہوکے میں نہ پڑتے کیونکہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ ”افسوس“ کے جو معنی اردو میں مشہور ہیں اس کے سوا بھی یہ لفظ کچھ معنی رکھتا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ ص ۱۷

حیف اس چارگرہ کپڑہ کی قیمت غالب

جس کی قیمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پہلے مصرعے میں بھی ”قیمت“ ہو ”قیمت“ نہیں۔ مصحح نے غالباً حسرت کے خیال سے متع کیا۔

ص ۳۸ قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارے

اصل میں ”کی“ نہیں ”کو“ ہے اور یہ فارسی محاورے کے مطابق ہے

ص ۵۳ کون ہوتا ہے حریفِ مے مردانگن عشق

ہے مکر رلب ساتی پہ صلا میرے بعد

اصل میں ”میں“ ہے نہ کہ ”پہ“۔

ص ۸۷ تماشا کر لے محو آئینہ داری

تجھے کس تما سے ہم دیکھتے ہیں !

اصل نسخے میں ”کر“ نہیں بلکہ ”کہ“ ہے جس کو یقیناً ”کر“ پر ترجیح ہے۔

ص ۱۰۰ زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد

دگر نہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے تھے

توقع کا میں گرتا ہے اصل نسخے میں دوسرا مصرعہ یوں ہے :

دگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

ص ۲۵۵

وضع میں اس کو اگر جانیے قاف تریاق

اصل نفع میں ”جانیے“ نہیں ”سمجھے“ ہے۔

ص ۲۵۸ دیکھیں کہ دے کوئی اس سرے کو بہتر سہرا

لیکن غالب نے تو یوں کہا ہے :

دیکھیں اس سرے سے کہ ف کوئی بہتر سہرا

ص ۲۶۲ پر جو چو تھا شعر برج ہے اُسے دو شعر قبل یعنی پہلے شعر کے بعد ہی درج ہونا چاہئے تھا۔

ص ۲۶۸ ہے قلم میرا بر گوہر بار

غالب نے اس مقام پر ”قلم میری“ لکھا ہے کسی کو کیا اختیار ہو کہ استاد کے لفظ کو بدلے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ کے کارپردازان سے امید ہو کہ آئندہ اشاعت میں صحت کا بہتر انتظام کریں گے اور غالب کو اصلاح دینے کی گستاخی کی تکرار نہ کریں گے۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

کرشمہ عشق

یہ دیوان پیر شیر محمد صاحب عاجز صدیقی چشتی نظامی کا ہے۔ اُن کے خاندان میں

بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں اور تصوف کا پران آپ کے گھرانے میں ہمیشہ روشن

رہا ہے۔ خود بھی اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ غزلیات میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہو

کہ اگرچہ آپ کا وطن علاقہ سندھ میں ہو اور وہیں آپ نے نشوونما پائی مگر زبان صاف اور فصیح ہے

اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہل زبان کا کام نہیں۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور اکثر صاحبوں نے تقریظیں اور

تاریخیں تحریر فرمائی ہیں۔ کتاب اعلیٰ حضرت حضور پر نور خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے نام سے معنون کی گئی ہو

رجم ۱۲۲ صفحہ قیمت معبر۔ پتہ۔ مینجر کتب خانہ چشتی صدیقی۔ گھاٹکہ خورد۔ ڈاک خانہ جلال آباد

ضلع فیروز پور)

ترانہ حبیب

یہ بھی پیر صاحب موصوف کی ایک نعتیہ نظم ہے۔ یہ نظم بہت سیدھی سادی صاف اور بے تکلف لکھی گئی ہے جسے بڑے لڑکیاں بھی آسانی سے پڑھ سکتی اور یاد کر سکتی ہیں۔ بحر بہت رواں اور آسان ہے (چھوٹی تقطیع پر ۳۶ صفحے - کاغذ اچھا - لکھائی اچھی اور صاف قیمت ۵ روپے)

سیر و سفر

یہ ہزکسینسی رائیہ راجایان سرکشن پر شاد ہمارا جہ بادریمن السلطنتہ کے سی آئی ای۔ جی سی آئی ای کا سفر نامہ اور نگ آباد دولت آباد خلد آباد، ممبئی، احمد آباد، اجیر متھرا، اگرہ وغیرہ مقامات کا ہے۔ جہاں کہیں تشریف لے گئے ہیں وہاں کے حالات بے تکلف بیان کئے ہیں۔ تاریخی حالات کا بھی جا بجا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب میں لطف پیدا ہو گیا ہو۔ ہمارا جہ سہمین السلطنتہ بہادر حیدر آباد کے نہایت روشن خیال امیر ہیں علمی ذوق رکھتے ہیں۔ شعر و سخن کے دلدادہ۔ اردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کا کلام ملک میں مشہور ہو چکا ہو۔ یہ سفر نامہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مختار الصرف

ہر زبان میں فعل سب سے مشکل ہوتا ہے۔ جب تک فعل کی مختلف گردانوں اور صیغوں پر قدرت حاصل نہ ہو، زبان نہیں آسکتی۔ مولوی سید مختار احمد صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ انگریزی فعل کا مجموعہ کی تمام گردانیں ترتیب کے ساتھ مع اردو ترجمہ اور مثالوں کے اس رسالہ میں لکھ دی ہیں اور فعل کے استعمال کی کوئی صورت ایسی نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔ طلبہ کو اس سے بڑی مدد ملے گی اور وہ آسانی کے ساتھ انگریزی فعل کے مختلف استعمالوں سے واقف ہو جائیں گے۔

(کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت بچ نہیں۔ مولف سے مل سکتی ہو۔ پتہ بیگم بازار۔ حیدر آباد دکن)

تاریخ

تاریخ الامت - حصہ سوم - خلافت بنی امیہ

تاریخ الامت - مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری، استاد تاریخ اسلام جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی تصنیف سے ہے۔ پہلے دو حصے اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا حصہ خلافت بنی امیہ پر ہے۔ یہ تاریخ مولانا نے صاف اور شستہ زبان میں لکھی ہے جو طلباء اور عام شائقین کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ بنی امیہ کی تاریخ پڑھنے کے قابل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر خلافت بادشاہت ہو گئی۔ جمہوریت کا رنگ بدل کر استبداد تک پہنچ گیا اور آزادی منقود ہو کر غلامی آگئی۔ مولانا نے تمام واقعات سادہ طور سے بیان کر دئے ہیں اور تعصب اور طرف داری کو دخل نہیں دیا۔ جامعہ ملیہ قابل مبارک باد ہے کہ اس نے طلباء اور عام پڑھنے والوں کے مطالعہ کے لئے کتابوں کا چھانڈو غیرہ جمع کر دیا ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ کتاب اچھا کاغذ پر چھپی ہے۔ لکھائی اور چھپائی بھی اچھی۔ حجم ۲۶۷ صفحے قیمت بھرہی جامعہ ملیہ علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

مذہب

(۱) **بصائر القرآن** | قرآن پاک میں جا بجا مختلف قصے اور روایتیں بیان کی گئی ہیں جن کا مقصد لوگوں کو نصیحت دینا یا عبرت دلانا یا کوئی مفید سبق سکھانا ہے۔ مولوی محمد مدنی صاحب اسٹنٹ منسٹر دفتر تاریخ ریاست بھوپال نے یہ بڑا اچھا کام کیا ہے کہ ان تمام قصوں کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے اس کتاب میں زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے قصے ہیں اور علاوہ ان کے دوسرے قصے بھی مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ قابل ملاحظہ ہے کہ یہ تمام قصے بے کم و کاست اسی طرح بیان کئے ہیں جس طرح قرآن پاک میں لکھے ہوئے ہیں البتہ قرین میں وضاحت کے لئے کہیں کہیں الفاظ اور جملے اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے

اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ اور سب قصے صاف سیدھے اور شستہ زبان میں بیان کئے ہیں جسے چھوڑ بیٹے سب آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک مفید کام یہ کیا ہے کہ ہر قصے کے آخر میں اس کے نتائج بھی لکھ دئے ہیں۔ جو بہت مفید اور سبق آموز ہیں۔

(کتاب طبی تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہے۔ قیمت پیر۔ حجم ۲۰۸ صفحے۔ نعل السلطان بک انجینی بھوپال سے مل سکتی ہے)

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے یارانِ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درسِ آملو و بہت افزا و جذبات آفریں زندگی کے بعض خصائص اپنی تالیف ”اسوہ صحابہ“ میں آشکار کئے تھے۔ اس میں صحابیات کے تذکرے بھی تھے۔ جو اب ایک علیحدہ رسالہ کی صورت میں ”اسوہ صحابیات“ کے نام سے نظر افروز ہوا ہے۔

کوئی شک نہیں کہ جمعِ حوادث میں کافی محنت کی گئی ہے۔ بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دئے ہیں جن میں بعض کے مقابلے ہم نے بھی کئے اور صحیح پائے۔ تاہم جناب مولوی صاحب کی محویت و استغراق اگر اجازت دے تو ایک دو باتیں عرض کرنے کی ہیں:

(۱) گوناگوں عزائمات میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تشنہ بحث نہ ہو۔

(۲) ہر ایک بیان مزید وسعت کا نیاز مند ہے جس کے لئے کچھ تھوڑی سی اور بھی کاوش درکار تھی۔

(۳) جن ماخذ سے اقتباس یا استنباط کیا گیا ہے ویسے ہی بلکہ بعض صورتوں میں وہی ایسے حقائق پر بھی روشنی ڈالنے ہیں جو اس رسالہ میں چھوڑ دئے گئے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قصہ کا سرسری بیان کافی نہ تھا جبکہ جن کتابوں سے یہ بیان ماخوذ ہے انہیں میں تفصیل بھی ہے۔

(۴) صحابیات کی زندگی کا ناکامہ جس طرح بھر گیا ہے وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں موجود ہے کہ شش مکہ حدیث کی بیسی کتابوں سے چند نمونے لاتیں لے لیں، کوہِ کندن و کاہِ برآوردن سے کچھ کم نہیں۔

بہر حال رسالہ اچھا ہے، اور بہت اچھا۔ ملک کو اس کی قدر اور قوم کو اس سے عبرت پذیر ہونا چاہئے۔

• قیمت کتاب ۷۰۰ ہے۔ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڑھ سے طلب کی جائے۔

(۳) القول الفرقان فی توضیح حقائق القرآن

یہ رسالہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے (کنٹب) نے حقائق القرآن کے جواب میں قوی دلائل اور پرزور طریقہ سے لکھا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کیمبرج کے ایم اے اور رینگیر ہی نہیں بلکہ عربی زبان اور علوم دینی میں بھی پوری

دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور قرآن کے مطالب و معانی پر بھی پوری طرح حاوی ہیں بھصفت نے حقائق القرآن میں قرآن مجید سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نفیلت اور ان میں الوہی صفات کے اثبات کی کوشش کی ہے اور چودہ دلائل اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ مولانا نے اس کی بڑی خوبی سے عقلی اور نقلی دلائل سے تردید کی ہے اور آخر میں عیسوی اور قرآنی تعلیم کا مقابلہ کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے جو صاحب اس قسم کی بحثوں اور فن مناظرہ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو بہت پسند کریں گے۔

(چھوٹی تقیط - حجم ۱۱۶ قیمت ۶/- دفتر جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام (۲۲۱۰) ایسٹ اسٹریٹ پونا سے مل سکتا ہے۔

(۴) اسلامی مساوات

اس رسالے میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب آنریری سکریٹری مسلم ایسوسی ایشن پھلواری شریف نے اسلامی تعلیم اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ

اسلام میں رنگ روپ، ذات پات کی کوئی تمیز نہیں اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ انوس ہے کہ کتاب

جمعہ نہیں چھپی۔ (چھوٹی تقیط - حجم ۶۶ صفحہ قیمت ۸/- منجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو پھلواری شریف - پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

صنعتِ حرفت

پارہ بانی

یہ کتاب ایم ایچ جی بی اے بی تی کی تالیف ہے۔ جس میں دیسی کرگے اور غلامی شل پر کڑا تیار کرنے کے آسان سے آسان طریقے بتائے گئے ہیں اور تمام ضروری ہدایات

یعنی سوت سے لے کر کپڑے بننے تک کے حالات بہت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اب تک ایسی جامع کتاب اس فن پر شایع نہیں ہوئی۔ جا بجا تصویروں کے ذریعے ضروری امور کو واضح کیا ہے۔ کتاب بہت صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور قابلِ مَوَلَف کی نظر تمام جزئیات پر معلوم ہوتی ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ ناواقف شخص بھی سمجھ جائے اور کام کرنے لگے۔ ایسے وقت میں جب کہ تمام اقوام ہند کے بزرگوں نے دیسی کپڑا پہننے اور چرخا کا تنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے، یہ کتاب رہنما کا کام کر سکتی ہے۔ نیز تمام مدارس صنعتی میں بطور نصاب کے داخل کی جاسکتی ہے۔ اس کتاب نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے اور اس کے قابلِ مَوَلَف منشی محمد حسین صاحب بی لے، بی ٹی قابلِ مبارک باد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل ملک ضرور اس کی قدر کریں گے۔

(کتاب اچھی چھپی ہے۔ حجم ۱۷۲ صفحے قیمت بی بی نہیں۔ کارخانہ لباس۔ گوبرانوالہ (پنجاب) سول سکتی ہے)

اردو کے جدید رسالے

اردوئے معلیٰ | اردوئے معلیٰ کا نام سنتے ہی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب مولانا حسرت موہانی یاد آجاتے ہیں۔ اُن کے رسالے نے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے جو ہمیشہ شکرگزاری کے ساتھ یاد کی جائے گی۔ اب اسی نام سے ایک تیس صفحہ کا ماہوار رسالہ دلی سے قربان علی صاحب سبیل کی اڈیٹری میں شایع ہوا ہے۔ اردوئے معلیٰ کو دلی سے خاص نسبت ہے لیکن اپنے نام اور مقام کے لحاظ سے جیسا یہ رسالہ ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہے۔ مضمون زیادہ تر دوسرے رسالوں سے ماخوذ ہیں اور بابتشار دو کے سب کے سب خیالی ہیں مثلاً دردِ دل، آخرِ وقت، عذرا کی سرگزشت، عالمِ خیال، تصویرِ جاناں، ایک پارسی ڈوئیز کو دیکھ کر۔ آخر میں چند صفحے نظم کے ہیں۔ ان میں بھی بعض نظمیں منقول ہیں۔ لیکن قیمت اس قدر کم ہے کہ اس میں اس سے بہتر رسالے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی صرف ایک روپیہ سالانہ ہے۔

یہ رسالہ بھی دلی سے شائع ہوا ہے۔ رسالے کے مقاصد کے متعلق اڈیٹر صاحب نے اپنے ”کریٹیکل برج البحرین“ کی اجرا کا سبب یہ ہے کہ ہم کسی مخصوص صنف کو تو رسالہ کے لئے موزوں نہ کریں کیونکہ

بعض رسالے محض مذہبی شان کے ساتھ مخصوص ہیں، بعض تاریخی حالات کے ساتھ، بعض محض طبی ہیں اور بعض ادبی رنگ میں ہیں اور بعض مختلف صنف میں بھی ہیں۔ لیکن ہم انشائے مذہب اور طب اور تاریخ و ادب کے ماسوا گزشتہ علوم و فنون اور متقدمین کے پسندیدہ کارآمد مقالات بھی درج رسالہ کریں گے، اس سے رسالہ کے مقاصد اور اس کی شان تحریر دونوں ظاہر ہیں۔ مختلف مضامین ہیں۔ لیکن ان میں یا تو مذہبی رنگ ہی یا بالکل خیالی ہیں۔ اور جن کا تعلق مذہب سے ہے ان میں بھی تخیل غالب ہے۔ جذبات میں بھی ہیں۔ لکھنے والوں میں علاوہ اور صاحبوں کو خواجہ حسن نظامی صاحب، ملا داد علی صاحب، راشد الخیری صاحب، آغا شاعر صاحب، حکیم محمد زید صاحب اور حکیم سید ناصر زید صاحب بھی ہیں۔

اڈیٹر حافظ محمد ابرار علی صاحب این جی پی القادری۔ حجم ۵۔ صفحے قیمت سالانہ دو روپیہ۔ قاسمی پریس دہلی شائع ہوتا ہے۔

اس نام کا ماہوار رسالہ بھی دلی ہی سے شائع ہوا ہے۔ اڈیٹر احمد وجودی۔ سرپرست خواجہ حسن نظامی۔ رسالے کا نام ”اڈیٹر اور سرپرست تمیزوں کے تیزوں عجیب و غریب ہیں۔ سرورق پر اس کا مقصد یہ لکھا ہے ”ہر قسم کے پنجابی خیالات کی معلومات عامہ کا پورا ذخیرہ“ پنجاب کے تمام اخبارات و رسائل و مجالس عامہ کی تحریروں و تقریر کا خلاصہ اور اس کے پانچ باب قرار دیے ہیں۔ پہلا باب مذہبی خیالات۔ دوسرا سیاسی خیالات؛ تیسرا معاش کے خیالات؛ چوتھا صحت کے خیالات، پانچواں معلومات عامہ غرض سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یعنی ہر قسم کے مضامین دوسرے اخباروں اور رسالوں سے نقل کر کے رکھ دیتا ہے مخالف و موافق سب موجود ہیں اگر خود خاموش ہیں۔ دین و دنیا کے مالک حضرت خواجہ حسن نظامی نے اس رسالہ کے مقاصد پر ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق صرف صوبہ پنجاب سے ہے کہ وہ اس صوبے کے خیالات کے مجموعہ کو اہل پنجاب اور دوسرے صوبوں کے سامنے پیش کرے اور بیت سے رسالے اور اخبار پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہے اس کے بعد فرماتے ہیں ”اس رسالہ کا مقصد محض یہ ہے کہ اُمیہ کی طرح ہر چیز کی صورت دکھادے“

یہ نہیں کہ کسی کے عیب و ہنر پر رائے زنی کرے۔ یعنی جو خیالات اس رسالہ میں درج کئے جائیں گے، ان میں رسالہ کے مولف کی ذاتی رائے کو دخل نہ ہوگا، ہماری رائے میں یہ رسالہ صرف وہی شخص پسند کر سکتا ہو جس کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہو۔ ورنہ اس بھولی کے رنگ بزمگ ٹکڑے کو نہ ہضم کر سکتا ہو۔ البتہ دلچسپ ضرور ہو۔ ہر فریق اور ہر مذہب والے کی رائے اور خیالات بے کم و کاست جرح ہیں۔ موالاتی بھی ہیں اور تارک موالات بھی، عیسائی بھی اور غیر عیسائی بھی، آریائی بھی اور سائن و صری بھی، قادیانی بھی اور ان کے مخالف بھی، غرض ہر قسم کی رائیں اور ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ پنجاب کے اخباروں اور رسالوں کا خلاصہ ہو۔ جو پڑھے سو بچائے اور جو نہ پڑھے سو بچکچا۔ بڑی تقطیع پر ۳۲ صفحے اور ہر صفحے کے دو کالم۔ قیمت بہت سستی یعنی ایک روپیہ سال، ایسی سستی قیمت میں ایسا مزید رسالہ ملنا نامکن ہو۔

حسن ادب لکھنؤ یہ بھی ماہانہ رسالہ ہو۔ اڈیٹر ابو الکمال محمد واحد علی لطف لکھنؤ اور سرپرست حضرت آرا مضمون مرزا سلطان احمد صاحب کا ہو۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بد نصیب رسالہ ہوگا جو جناب مرزا صاحب کا پُر نویس قلم کا زیر بار احسان نہ ہو۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہو کہ رسالے کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں بلکہ خیال میں آنے سے قبل آپ کا مضمون پہنچ گیا ہو۔ یہ مضمون ”مذہبی علمی رنگ میں ہو“ اور مرزا صاحب نے پتہ غلام رنگ میں لکھا ہو۔ یعنی الفاظ، جملے، فقرے، سب سمجھ میں آتے ہیں لیکن مضمون بحیثیت مجموعی فہم سے کتر کر نکل جاتا۔ دو تین اور مضمون بھی ہیں ان میں بھی زیادہ تر خیالی تک بندی ہے۔ صرف دیکھو کے تحت میں اتنی پر ایک مضمون ہو اور اس کے بعد چند نظمیں ہیں۔ بہت معمولی رسالہ ہو افسوس ہے کہ دہلی اور لکھنؤ سے کوئی قابل قدر علمی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔

کاغذ لکھائی چھپائی معمولی بلکہ معمولی سے بھی کم۔ قیمت ہر سالانہ

درویش یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ ہو جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ سے شائع ہوتا ہو۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی ہیں اس رسالہ کو بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کی سرپرستی اور

رایت کا مخر حاصل ہے۔ مقصد نام سے ظاہر ہے لیکن اہم مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ وہ اشاعت اسلام اور تبلیغ مذہب کے مفید ذرائع کی طرف رہنمائی کرے گا۔ جس کا سب سے بڑا ذریعہ غالباً مریدی معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس مقصد کے وہ ”ملک کے دیگر اہم مسائل پر بھی بخیرگی کے ساتھ رائے ظاہر کرے گا“ اور اس میں شبہ نہیں کہ رسالہ کا جو مقصد انھوں نے بیان کیا ہے اسے پورا کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہے مگر اس میں سب سے عجیب اور قابل دید وہ غلطیاں جو مریدان باعقیدت نے اپنے پیر طریقت یعنی خواجہ صاحب کے نام لکھے ہیں۔ اور حضرت پیر نے بڑے شوق اور غم سے ان کو درج کیا ہے۔ یہ خط اشتہار کا بھی کام دیتا ہے، ترغیب کا بھی، ایک طرف مرید کی حسن عقیدت بتاتی ہیں اور دوسری طرف پیر کی حکمت نفسیاتی۔ پیری کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ پیر دین کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر نیا کو خوب سمجھتا ہو اور انسانی نظرت کی گہرائیوں پر پورا عبور رکھتا ہو۔ ان خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب سن فن شریف کے اہام ہیں اور اس لئے ہم ان کی دل سے قدر کرتے ہیں اگرچہ اس رسالہ میں ملک کے دوسری مسائل بحث کی جاتی ہے مگر وہ سب اہل مقصد کے ماتحت ہیں۔ گویا دوسرے مضامین اہل معنوں کے لئے چاشنی کا کام دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی طبیعت میں جدت پائی جاتی ہے اور اس سے وہ ہر جگہ کام لیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے نذرات اور اڈیٹوریل نوٹس کی جگہ رسالے کی خصوصیت کے لحاظ سے تجلیات کا لفظ تجویز فرمایا ہے جس میں ہرے مزے کے چٹکے اور رنگ برنگ کی گل افشائیاں فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے مضامین ہوتے ہیں جن میں سیاسیات، یادِ رنگاں، منقولات، نقد و نظر، مواظبت، کیف سخن سب ہی کچھ آجاتا ہے۔ اچھا خاصا لدستہ ہے مگر رنگ و خاص رکھتا ہے۔

چشم بد دور، خواجہ صاحب کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اب اس میں اشاعت و تبلیغ اسلام کا اور اضافہ ہے جس نے عقیدت مند مریدوں کے دلوں میں نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہے یہ ایک اور ثبوت ہے اس بات کہ خواجہ صاحب کی نظر کس قدر غائر ہے اور وہ انسانی نظرت کے اسرار کے سمجھنے میں کس قدر کمال رکھتے ہیں۔ اور جب ہم ان کی تازہ تصانیف حلال خور، ہندو مذاہب کی معلومات، سکھ قوم وغیرہ کا اشتہار اس رسالے میں دیکھتے ہیں تو ہم ان کے مشرب کی وسعت اور ہمہ گیری کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ دن دور نہیں کہ یہ رتیں ضرور کوئی نیا رنگ لائیں گی۔

درویش ایک دلچسپ رسالہ ہے۔ معلومات بھی اس میں مختلف قسم کی ہیں۔ زبان بھی اس کی فصیح اور بے تکلف ہے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس میں ایک ایسی چیز ہے جو دوسرے رسالوں میں نہیں پائی جاتی اور اس نے پڑھنے کے قابل ہے۔ درویش، درویشی سکھائے یا نہ سکھائے لیکن اس میں شک نہیں کہ پیر پرستی ضرور سکھادے گا۔ اس سے مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ مریدی کی اشاعت میں اس ضرر کو مٹا دیا ہوگی جو لوگ ملک کے مختلف حالات اور مسائل کے علم کا شوق رکھتے ہیں وہ زندگی کے اس اہم شبیہ کو بھی ضرور مطالعہ فرمائیں۔ کیونکہ پیری مریدی بھی ”الم (علم) دریاؤں سے“

درویش بڑی قطع پر دو کالموں میں چھپتا ہے۔ چھپائی گنجان اور صاف ہوتی ہے۔ کاغذ اچھا، حجم کم صفحے مینے میں دو بار شائع ہوتا ہے سالانہ چندہ دو روپیہ۔

لسان الملک | حیدر آباد دکن میں ایک اور ماہانہ رسالے کا اضافہ ہوا ہے اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور شاعر سید محمد ضامن صاحب کنتوری ہیں جن کے کلام سے شعر و سخن کے شایق خوب واقف ہیں۔ یہ پہلا نمبر ہے جو جولائی میں شائع ہوا تھا اس کے بعد سے کوئی رسالہ وصول نہیں ہوا۔ اس میں ۱۹ مضامین ہیں جن میں سے ۹ نظمیں ہیں اور دس مضمون نثر کے ہیں۔ مضامین ہر قسم کے ہیں۔ مضامین نگاروں میں جناب مرزا سلطان احمد صاحب بھی ہیں۔ مرزا صاحب کی پر نویسی پر رشک آتا ہے۔ یہ مضمون ”رنج و خوشی“ پر ہے اور ان کی خاص طرز میں ہے ایک مسلسل ناول کی پہلی قسط بھی نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ ہے یا تصنیف۔ اس کے لکھنے والے جناب لوی مرزا محمد علی صاحب کو کتب ہیں۔ کوئی مضمون خاص طور پر ایسا نہیں ہے جو علمی تحقیق، معلومات یا جدت کے لحاظ سے قابل توجہ ہو۔ حضرت ضامن نے لارڈ ٹینیسن کی اینک آؤن کارڈ میں ترجمہ کیا ہے۔ اس مثنوی کا کچھ ابتدائی حصہ اس میں شائع ہوا ہے۔ ترجمہ بہت بے تکلف، رواں، فصیح اور شگفتہ ہے۔ ضامن صاحب کے جانشین اڈیٹر سید منظر علی صاحب آشر ہیں۔

(جگم ۶۴ صفحہ۔ قیمت پانچ روپیہ سالانہ)

ایک فارسی زبان کا رسالہ

ایران شہر | فارسی زبان کا علمی اور ادبی با تصویر رسالہ - مقام اشاعت : برلین (جرمانیا) سالانہ چندہ ایک انگریزی پاؤنڈ - ہندوستان کے لئے مرزا محمد حسن گازی، تجارت خانہ، دہشتی بلی گماشتے کے طور پر کام کرتے ہیں۔

یہ ماہانہ رسالہ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ سے آقا حسین کاظم زادہ کی ادارت میں برلین سے نکلتا ہے۔ مدیر کے اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر صفحہ میں دو بار نکلا کرے گا۔ حجم پہلے ۱۶ صفحے تھا لیکن اب ۳۲ صفحے ہو چکا ہے اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ عبارت فصیح اور عام فہم۔ مضامین دلچسپ اور مفید۔ سب سے بڑی خوبی اس رسالہ میں یہ ہے کہ جو مضمون اس میں چھپنے کو بھیجا جاتا ہے۔ مدیر کو اس کی عبارت درست کرنے کا پورا اختیار ہے۔ چنانچہ پہلے ہی شمارے میں کہہ دیا گیا ہے۔

”ادارہ ایران شہر، در اصلاح عبارات مقالہ، بدون دست زدن بہ اصل مطلب، آزاد است“
کاش اردو رسالوں میں بھی ایسی انتظام ہوتا کہ غلط عبارت نہ چھپنے پاتی۔ آج کل اردو رسالے غلط ترکیبوں، نامانوس لفظوں اور اورتراپیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

- پہلے چھ پرچوں میں جو مضمون درج ہیں ان میں سے یہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں :-
- (۱) تشکیلات داریوش اول در کشور ایران (ہخامنشی خاندان کے نامور بادشاہ داریوش کے نظم و نسق پر)
 - (۲) تشریح شناسی و غرب شناسی۔
 - (۳) تعلیم و تربیت در میان ایرانیان قدیم۔
 - (۴) جنگ دارا و اسکندر و انقرض سلطنت ہخامنشیان (بالتصویر)
 - (۵) شولے جنگی داریوش اول (بالتصویر)
 - (۶) ایران شہر (برلین کے مشہور ایران شہر، اسٹاڈمارکوارٹ کے قلم سے)

(۷) خطبائے یمنی در کتبہ ہائے ایران

(۸) نامہ یزدگرد دوم بہ عیسویان ارمنستان (آج کل کے ایک مشہور وطن پرست ایرانی شاعر پورداود کے قلم سے)

(۹) داستان خم نشستن افلاطون (بالتصویر)

(۱۰) علم اساطیر (دین مارک کے مشہور ایران شناس، استاد کریستنسن کے قلم سے)

ان میں اکثر مضمون تاریخی ہیں اور مستند جرمانی یا فرانسیسی کتابوں سے لئے یا ترجمہ کئے گئے ہیں مضمون نشان (۶) کو استاد مارکوارٹ نے جرمانی زبان میں لکھا تھا جسے رسالے کے کارپردازان نے فارسی میں لکھ کر چھاپا ہے مگر فارسی ترجمے پر بھی مصنف نے نظر ثانی کر کے کہیں کہیں اصلاح دی۔ خود ان کے نام کے ساتھ ”پروفیسر“ لکھا گیا تھا۔ مگر اس یورپی لفظ کو فارسی تحریر میں انھوں نے ناپسند کر کے ”اندرز بد“ بنا دیا کہ دریائی زمانے کی فارسی میں (جسے بعضے لوگ ”پہلوی“ کہتے ہیں) معلوم کے لئے ”اندرز بد“ استعمال ہوتا تھا۔ مضمون نشان (۱۰) استاد کریستنسن کی فارسی انشا پردازی کا نمونہ ہے۔

”ایران شہر“ والوں نے یورپی لفظوں یا اصطلاحوں کا ترجمہ فارسی میں خوب کیا ہے۔ ان میں بعضے ایسے لفظوں کا فارسی ترجمہ بھی ہے جن کے عربی مرادف ایران اور ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ”ایران شہر“ نے جو ٹھیک فارسی لفظ پیش کئے ہیں ان میں بیشتر موزوں اور عام فہم ہیں۔ من جملہ ان کے تھوڑے سے یہاں لکھ جاتے ہیں

شرق شناس = (مشرق) *orientalist*

ایران شناس = *Iranist*

مصر شناس = *Aegyptologist*

عرب شناس = *Arabist*

غرب شناس = *occidentalist*

شاہ کار = *masterpiece*

اغورز بد = *Professor*

Inscription

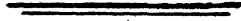
نگہبشتہ = (کتبہ)

The art of writing articles (Journalism) = پتیز نویسی

Folklore = علم اساطیر

رسم خط میں بھی کہیں کہیں اصلاح کی گئی ہے پناچہ ”کتاب خانہ“ (یعنی ایک کتاب خانہ) کے بجائے
”کتاب خانہ لے“ وغیرہ لکھا ہے۔ مگر عبلا ہندوستان کے حضرات کا ہے کو مانیں گے۔

(ڈاکٹر عبدالسار صدیقی۔ پی ایچ ڈی)



انجمن ترقی اردو کا ذکر

انجمن کے ارکان اور یہی خواہوں کی اطلاع کے لئے یہ ضروری ہے کہ انجمن کے کاموں کا ذکر وقتاً فوقتاً اس رسالہ میں ہوتا رہے اس وقت جو جو ترجیح اور تالیفات زیر ترتیب یا طبع ہیں یا اور جو کام انجمن کر رہی ہے یا اس کے مد نظر ہیں، ان کا ذکر مختصر طور سے ذیل میں کیا جاتا ہے۔

۱۔ گزشتہ ماہ ذی الحجہ میں ایک مجلس کا انعقاد اس غرض سے کیا گیا کہ اردو رسم خط میں بعض ضروری اصلاحوں پر غور کرے اور اردو میں اوقات کا تعین کرے۔ اس کی مفصل رپورٹ اسی رسالے میں کسی دوسری جگہ درج ہے۔

۲۔ سرگزشت حیات مترجمہ جناب مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور مفید کتاب ہے اس میں حیات کی ابتدا اور اس کے ارتقا کا حال اور پھر انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کا ذکر نہایت سلاست اور خوبی سے کیا گیا ہے۔ اور ہر مسئلے کا سائنس کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی جلد زیر طبع ہے۔

۳۔ اس سال سرکار نظام نے جناب نواب مسعود جنگ بہادر (جناب سید اس مسعود صاحب) ناظم تعلیمات ممالک محرومہ سرکار عالی کو خاص طور پر جاپان کے تعلیمی حالات کے مطالعہ کے لئے بھیجا تھا۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں سے اگر سرکاری پیش کرنے کے لئے ایک رپورٹ لکھی جو نہایت دلچسپ اور پر از معلومات ہے۔ شروع میں ضروری تاریخی حالات ہیں۔ اس کے بعد جاپان کی ترقی کا راز، وہاں کے تعلیمی نظام وغیرہ پر مفصل طور سے لکھا ہے۔ اس سے بہتر کتاب جاپان پر کوئی ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب بھی زیر طبع ہے، اور بفرمان اعلیٰ حضرت و اقدس فلاحیہ ملکہ انجمن کو چھاپنے کے لئے دی گئی ہے۔

۴۔ سرکار نظام نے مدارس وسطانیہ (مڈل اسکولوں) کے لئے مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ ہند پر ایک کتاب لکھوائی ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے اس سے قبل میٹرکولیشن اور انٹر میڈیٹ

کے لئے نہایت عمدہ ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب بھی اُسی پایہ کی ہو اور صاف اور سلیس زبان میں لکھی ہو باجائز سرکار یہ کتاب بہت جلد انجمن طبع کرے گی۔

۵۔ تاریخ ادبیات ایران (مصنفہ پروفیسر براؤن) کا ترجمہ ایک مدت سے ہو رہا تھا۔ اب پہلی جلد بعد نظر ثانی تیار ہو گئی ہو۔ چونکہ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہو لہذا فی الحال ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہو وہاں سے فراغت ہونے کے بعد طبع کے لئے دی جائے گی۔

۶۔ تاریخ ادبیات عرب (مصنفہ پروفیسر نکسن) کا ترجمہ بھی قریب الاقتمام ہے۔ شروع کے اجزاء ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہیں۔ اس کی طبع کا انتظام بھی جلد کیا جائے گا۔

۷۔ انجمن نے ”Science Malaries“ کا ترجمہ سائنس کے حصوں کے نام سے کر دیا ہو۔ اس کا مصنف ایک فرانسیسی عالم فابر ہے جو سائنس کے مسائل کو سلیس اور صاف ستھری زبان میں بیان کرنے میں کمال رکھتا ہو اور خاص کر حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کے حالات ایسی دلچسپی سے لکھتا ہو جیسے دیو پریوں کو قتلے، اس لئے اُسے حشرات الارض کا ہومر کہتے ہیں۔ ترجمہ ہو چکا ہو۔ نظر ثانی کی جا رہی ہو عام پڑھنے والوں اور لڑکوں لڑکیوں کے لئے بہت ہی اچھی کتاب ہو۔

زیر ترتیب لغات

انجمن اس وقت لغت پر کئی کتابیں تیار کر رہی ہے۔

۱۔ سب سے اول اصطلاحات علمیہ کی لغت ہو۔ اس کی پہلی جلد بالکل تیار ہے۔ صرف ترتیب دی جا رہی ہو ایک مہینے کے اندر ہی اندر طبع کے لئے بیچ دی جائے گی۔

۲۔ دوسری لغت پیشہ دروں کے اصطلاحات کی ہو۔ یہ بھی تیار ہو چکی ہو۔ صرف ترتیب باقی ہو جس کا کام جاری ہو۔ اس کی تیاری میں بہت محنت صرف ہوئی ہو بعد ترتیب تصویروں اور لغتوں کا انتظام کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب مکمل ہو جائیں گے تو طبع کا انتظام ہو گا۔ یہ لغت بالکل جدید ہو اور نہایت مفید ثابت ہوگی۔ اب تک اس قسم کی کتاب ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۳۔ تیسری لغت 'انگریزی سے اردو کی' ہے۔ ترجمہ کے لئے Concise Oxford Dictionary انتخاب کی گئی ہے جو انگریزی کی نہایت مستند لغت ہے۔ ایک ایک حرف ایک ایک صاحب کو ترجمہ کے لئے دیا گیا ہے جو حرف بہت طویل ہیں ان کے دو دو تین تین ٹکڑے کر کے مختلف صاحبوں کو دے گئے ہیں۔ تقریباً تیس حضرات اس کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ یہ پہلا علمی کام ہے جو اردو زبان میں مشترکاً محنت اور اعانت سے انجام پائے گا۔ اس زمانے میں ایسی لغت کی جیسی کچھ ضرورت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

۴۔ چوتھی لغت اردو زبان کی ہے۔ کئی سال ہوئے میں نے خاکے کے طور پر ایک مضمون لکھا تھا کہ اردو زبان کی لغت کیسی ہونی چاہئے۔ اور ارادہ تھا کہ اسی نہج پر ایک محققانہ علمی درجہ کی لغت لکھی جائے۔ لیکن انجمن اس صہ کثیر کی تحمل نہ ہو سکی۔ اور نہ کوئی بیرونی امداد مل سکی۔ لہذا مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا۔ اب بعد غور کے یہ تدبیر کی کہ پہلے ایک چھوٹی لغت لکھی جائے جس میں زبان کے کل الفاظ اور محاورات، نیز جدید الفاظ جو اس زمانے میں زبان میں داخل ہو گئے ہیں درج ہوں۔ مختصر طور سے الفاظ وغیرہ کی تحقیق بھی کی جائے۔ غرض ایسی کتاب ہو جو عام طور پر اردو پڑھنے والوں اور طالب علموں کے لئے مفید ہو۔ لیکن جو کچھ لکھا جائے وہ مستند ہو علاوہ اس کے اس میں وہ قدیم الفاظ بھی درج کئے جائیں گے جو کسی اردو لغت میں نہیں ملتے مگر مسلم اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں تاکہ اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کو مدد ملے۔ یہ کام شروع ہو گیا ہے اور انشاء اللہ ایک سال میں اختتام کو پہنچ جائے گا۔

انجمن اردو نستعلیق ٹائپ کے تیار کرنے کی بھی فکر کر رہی ہے اس میں ایک حد تک کامیابی ہو چکی ہے اور امید ہے کہ بہت تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ٹائپ تیار ہو جائے گا۔ اگر یہ ٹائپ خاطر خواہ تیار ہو گیا اور انشاء اللہ ضرور ہو جائے گا تو میں اسے انجمن کی بڑی کامیابی خیال کروں گا۔

عبدالحق

سکرٹری انجمن ترقی اردو

فہرست مطبوعات جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

نمبر	نام کتاب	تعداد	نمبر	نام کتاب	تعداد
	فہرست کتب مدخلہ نصاب جماعت ایلک			فہرست کتب مدخلہ نصاب میٹرک یونیورسٹی	
۸۵	علم مشق حصہ اول	۸	۱۰	کاغذ درجہ اول	۱۰
۱۳	جبر و مقابلہ	۹		کاغذ درجہ دوم	
۵	سکونیات	۱۰	۵	کاغذ درجہ اول	۱۰
۶	ہندسی محفوظات	۱۱	۳	کاغذ درجہ دوم	۱۱
۱۲	ہندسہ محجمات	۱۲	۱۰	طبیعیات حصہ اول	۱۰
۴	علم حرکت	۱۳	۱۵	حصہ دوم	۱۵
۱۳	طبیعیات حصہ اول	۱۴	۹	کاغذ درجہ اول	۹
۱۵	حصہ دوم حرارت	۱۵	۳	کاغذ درجہ دوم	۳
۱۲	حصہ سوم نور	۱۶	۱۲	کاغذ درجہ اول	۱۲
۱۴	حصہ چہارم آواز	۱۷	۴	کاغذ درجہ دوم	۴
۱۰	حصہ پنجم مقناطیس	۱۸	۱۱	مرقات	۱۱
۱۳	حصہ ششم برقی	۱۹		غیر مجلد	
۱۰	طبیعیات علی حصہ اول	۱۵		جسبہ ثانیہ	
۱۴	حصہ دوم			کاغذ درجہ دوم	
۱۴	حصہ سوم				

تاریخ کتاب	نام کتاب	تاریخ کتاب	تاریخ کتاب	نام کتاب	تاریخ کتاب
۱۶	یکمیا حصہ اول	۱۱	۱۱	کافذ درجہ اول	تاریخ انگلستان حصہ چہارم
۱۷	کافذ درجہ دوم	۱۲	۱۲	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۱۸	کافذ درجہ اول	۱۳	۱۳	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۱۹	کافذ درجہ دوم	۱۴	۱۴	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۲۰	کافذ درجہ سوم	۱۵	۱۵	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۲۱	کافذ درجہ دوم	۱۶	۱۶	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۲۲	تاریخ ہند حصہ اول	۱۷	۱۷	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۲۳	کافذ درجہ دوم	۱۸	۱۸	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۲۴	کافذ درجہ سوم	۱۹	۱۹	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۲۵	کافذ درجہ دوم	۲۰	۲۰	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۲۶	کافذ درجہ اول	۲۱	۲۱	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۲۷	کافذ درجہ دوم	۲۲	۲۲	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۲۸	کافذ درجہ سوم	۲۳	۲۳	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۲۹	کافذ درجہ دوم	۲۴	۲۴	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۳۰	کافذ درجہ اول	۲۵	۲۵	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۳۱	کافذ درجہ دوم	۲۶	۲۶	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۳۲	کافذ درجہ سوم	۲۷	۲۷	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۳۳	کافذ درجہ دوم	۲۸	۲۸	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۳۴	کافذ درجہ اول	۲۹	۲۹	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۳۵	کافذ درجہ دوم	۳۰	۳۰	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۳۶	کافذ درجہ سوم	۳۱	۳۱	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۳۷	کافذ درجہ دوم	۳۲	۳۲	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۳۸	کافذ درجہ اول	۳۳	۳۳	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۳۹	کافذ درجہ دوم	۳۴	۳۴	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۴۰	کافذ درجہ سوم	۳۵	۳۵	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۴۱	کافذ درجہ دوم	۳۶	۳۶	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۴۲	کافذ درجہ اول	۳۷	۳۷	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۴۳	کافذ درجہ دوم	۳۸	۳۸	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۴۴	کافذ درجہ سوم	۳۹	۳۹	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۴۵	کافذ درجہ دوم	۴۰	۴۰	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۴۶	کافذ درجہ اول	۴۱	۴۱	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۴۷	کافذ درجہ دوم	۴۲	۴۲	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۴۸	کافذ درجہ سوم	۴۳	۴۳	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول
۴۹	کافذ درجہ دوم	۴۴	۴۴	کافذ درجہ دوم	کافذ درجہ دوم
۵۰	کافذ درجہ اول	۴۵	۴۵	کافذ درجہ اول	کافذ درجہ اول

ردیف	نام کتاب	جلد	ردیف	نام کتاب	جلد
	تاریخ یونان جلد دوم	۳۸		فهرست کتب در خط نصاب جامعیت بی	
	کاغذ درجه اول		۲۹	تاریخ دستور انگلستان	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه دوم				
	عروج فرانس	۳۹		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			پرک لینز	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	دکھاوڑی	۴۰		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			ہندی مملکت برطانیہ	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	مادھوجی سندھیا	۴۱		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			رنجیت سنگھ	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	تنبیہ والا شرف	۴۲		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			تاریخ ہندو برطانیہ	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	تاریخ فرشتہ جلد اول	۴۳		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			قدیم تاریخ ہند	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	کامل ابن اثیر جلد اول	۴۴		کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			یورپ جدید	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	جلد دوم			کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			ویلزی	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	جلد سوم			کاغذ درجه دوم	
	کاغذ درجه اول				
	کاغذ درجه دوم			یونانی شنشاپی	کاغذ درجه اول
	کاغذ درجه اول				
	طبیعیات نور	۴۵		کاغذ درجه دوم	

نمبر	نام کتاب	کتاب	نمبر	نام کتاب	کتاب
۳۵	طبیعیات نور	کافذ درجہ دوم	۵۵	مفتاح المنطق	کافذ درجہ اول
	= آواز	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۵۶	علم الاخلاق	کافذ درجہ اول
۳۶	طبیعیات عملی متناطیس برق	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۵۷	معیشہ الہند	کافذ درجہ اول
۳۷	علمی کیمیا	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۵۸	اصول معاشیات	کافذ درجہ اول
۳۸	نظری نامیاتی کیمیا	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۵۹	دہرہ شامستر	کافذ درجہ اول
۳۹	غیر نامیاتی کیمیا	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۶۰	قانون ثارث	کافذ درجہ اول
۵۰	علم مثلث تحلیلی حصہ دوم	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم	۶۱	شرح محمدی	کافذ درجہ اول
۵۱	سکون و سیالات	کافذ درجہ اول		=	کافذ درجہ دوم
	=	کافذ درجہ دوم			
۵۲	ہندسہ تحلیلی	کافذ درجہ اول			
	=	کافذ درجہ دوم			
۵۳	جبر و متعادلہ حصہ دوم	کافذ درجہ اول			
	=	کافذ درجہ دوم			
۵۴	حکمت الاشراق	کافذ درجہ اول			
	=	کافذ درجہ دوم			

نوٹ

(۱) جن کتابوں پر قیمتوں کا اندراج نہیں ہو رہا ہے وہ زیر طبع ہیں۔

(۲) فزائش کے ساتھ کتاب مطلوب کی ربح قیمت پیشگی وصول ہونے پر بعد منہائی رقم وصول شدہ کتابیں ذریعہ دی پی روانہ کی جائیں گی۔

(۳) پٹے کے مصارف خریداری کے ذمہ ہوں گے۔

(۴) جلد خط و کتابت ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ سے ہونی چاہئے۔

ناظم

شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ شاہانہ سرکار عالی جیو راولپنڈی

مطبوعات انجمن

القول الاظهر۔ امام ابن مسکویہ کی معرکہ الاراء تصنیف
نورالاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہی یہ کتاب فلسفہ الہین کے
اصول پر لکھی گئی ہو۔ اور مذہب اسلام پر انہیں اصول
کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت ۷۰ کھدار

رہنمایان ہند۔ مشہور کتاب پر نفیس اور انڈیا
کا ترجمہ ہے۔ ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان
فاضلانہ مگر دلکش پیر میں لکھا ہے۔ اس کے بعد سری کر
جی ہمارا جگوتم بدھ وغیرہ کے حالات ہیں۔ ۷۰ کھدار

المقرر قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے
بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں ان سب کو
جمع کر دیا یہ طرز بیان دلچسپ اور کتابا یک نعمت ہو۔ ۱۰ کھدار
الہیرونی۔ کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مترجم
تعاریف سے مستغنی ہو۔ دسویں صدی کا فاضل ہو مگر تجرعلی

اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہو
الہیرونی اسکے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہو قیمت ۱۰ کھدار

قاعدہ و کلیہ قاعدہ۔ یہ قاعدہ مدت کے غور
و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول
اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے ان کی تشریح کے
لیے ایک کلید بھی طیار کی گئی ہر قاعدہ ۱۰ کھدار

تذکرہ شعرائے اردو۔ مؤلف میر حسن بھٹی۔
میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں ان کی متنوی بدیع
کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو
نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اسی مقبول اور نامور استاد کی تصنیف
ہو۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے ہم پہنچا کر
طبع کی گئی ہو۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت
ہو۔ اس پر مولانا محمد مصیب الرحمن خاں صلب شروانی نے
ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہو جو قابل پڑھنے

کے ہو قیمت فی جلد ۱۰ کھدار غیر مجلد ۷۰ کھدار
تاریخ تمدن۔ سر سائمنس بل کی شہرہ آفاق کتاب کا ترجمہ
ہے۔ الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جماعت
سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی ہتھیار
سے کام لیا گیا ہو اس کے مطالعہ سے معلومات میں
انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہو حصہ اول
۷۰ کھدار

مقدمات الطببیات۔ یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان
کے مشہور سائنس دان حکیم کسلے کی کتاب کا جس کا نام
کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں بظاہر فطرت کی بحث
درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہو۔ ۷۰ کھدار

فلسفہ تعلیم ہر برٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہے۔ غور و فکر کا بہترین گانامہ اللہ تعالیٰ کے لیے چراغ ہدایت ہے تربیت کے ربانی قوانین کو استدراجت کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہو اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے قیمت دسے کھدار پنولین عظیم ایسٹ کی مستند کتاب کا اردو ترجمہ کتاب کے مطالعہ کے معلوم ہو گا کہ پنولین کی زندگی بشری جدوجہد کا آخری باب ہے۔ واقعات کی دوا دیا تو سکند کی زبان ادا کر سکتی ہو یا تیمور کی زبان ترجمہ آسان اور عام فہم ہے قیمت ۷۷ کھدار

دریائے لطافت ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشا اللہ خاں کی تصنیف ہے اردو و صرف نحو اور محاورہ اور الفاظ کی پہلی کتاب ہو۔ اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں قیمت - ۷۷ کھدار طبقات الارض اس فن کی پہلی کتاب ہے تین سو صفحات میں تقریباً جملہ مسائل قبلہ کے ہیں کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور ان کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے قیمت ۷۷ کھدار مشاہیر لویان ورو ماترجمہ ہے میرت نگاری اور انشا پردازی میں اہل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس آج تک مسلم اثبات چلا آتا ہے۔ دیکھا یہ عالم ہے کہ سیرت

نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہو۔ وطن پرستی اور بے نفی عزم جو ان مردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور جلد اول غیر مجلد دسے کھدار جلد دوم غیر مجلد ۷۷ کھدار اسباق النحو ملک کا دیبہ کامل مولانا محمد لیلین صاحب بی لے کی تالیف ہے اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہے قیمت ۷۷ کھدار علم المعیشت اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد ایلاس صاحب برنی ایم نے ملک پرست بڑا احسان احسان کیا ہے معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ بہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں۔ اشتراکیت کا باب قابل دید ہے۔ حجم ۵۰۰ قیمت مجلد ۷۷ کھدار

تاریخ اخلاق یورپ اصل مصنف پروفیسر لکی کا نام علم و تجربہ تحقیق و صداقت کا مرادف ہے یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن معاشرت اصول اخلاق مذاہب و خیالات مرتع ہے حصہ اول دسے حصہ دوم مجلد ۷۷ کھدار تاریخ یونان قدیم یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ اس کا نقطہ خیال خالص ہندوستانی ہے ایف لے کلاس کے طلباء جو یونانی قدیم تاریخ کو گہرا تے ہیں اس کتاب کو انتہاء جو مفید پائیں گے مجلد ۷۷ کھدار

انتخاب کلام میر میر تقی میر تاج شعرائے اردو کے
کلام کا انتخاب ہو مولوی عبدالحق صاحب کٹر ری نظم
ترقی اردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت بعد کیا ہو
اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر مضمون کا
ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہو۔ قیمت ہر کھدار

رسالہ نباتات۔ اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی
اصطلاحات سے معراج سلاست و روانی سے مملو اور
دیکھنا مفید ہے۔ طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں
نہ سمجھ سکیں وہ اس سالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد ہر کھدار
دیباچہ صحت۔ اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا
پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ مبسوط اور دیکھنا بحث
کی گئی ہو۔ زبان عام فہم اور پیرایہ نوثر و دل پذیر ہے۔
ملک کی بہترین تصنیف ہو اس کا مطالعہ کسی ہزار شخصوں سے
زیادہ قیمتی ثابت ہو گا۔ حجم ایک ہزار صفحہ قیمت مجلد لکھ
قواعد اردو۔ ارباب فن کا اتفاق ہو کہ اردو زبان
میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بطور شرح کے علاوہ
اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا
گیا ہے قیمت ہر کھدار

نکات الشعراء یہ اردو کا تذکرہ استاد الشعراء میر تقی مرحوم
کی تالیف سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات
بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں نیز میر صاحب

کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل
ہیں۔ مولانا مصیب الرحمن صاحب شروانی صدر الصدور
امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور
دیکھنا مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد ہر کھدار

فلسفہ جہد بلاغت۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا
مشہور نفیسی ہو۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت
پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی
ہے متعلقانہ نفعیات اسے نہایت مفید پائیں گے۔ مجلد
ہر کھدار غیر مجلد ہر کھدار

وضع اصطلاحات۔ یہ کتاب ملک کے نامور اشراف و
اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (بروفیسر عثمانیہ کالج) نے
سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہو
بقول فاضل مولف یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ میرے علم میں
شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں
لکھی گئی ہو نہ ایشیا کی کسی زبان میں اس میں وضع اصطلاحات
کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اسکے اصول
قائم کیے گئے ہیں۔ مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہو
اور زبان کی ساخت اور اس کے خاص ترکیبی مفرد و مرکب
اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں اردو مصداق
متنقات غرض سینکڑوں دیکھنا و علمی بخش زبان کے متعلق
آگئی ہیں“ اردو میں بعض ادبی ایسی کتابیں ہیں جن کی نسبت

لکھا جاسکتا ہے کہ زبان میں اُن کی نظیر نہیں لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اُردو کو علی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آئندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے

کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۵۰ قیمت مجلد ہے کھدار
نفع المطیب۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مروج کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ صفحات ۴۰ قیمت مجلد (سے) کھدار

محاسن کلام غالب۔ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری مرحوم کا مکرر الآرا مضمون ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت ہے کھدار

دیوان غالب جدید و قدیم۔ یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بھی انتظار تھا اس میں میرا

غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ ہر صاحب کے قدیم کلام ملنے کی کوشش تھی۔ یہ محض متن اتفاق تھا کہ باخدا کیا اور اب ریاست جو بال سرحد میں چیکر شائع ہو ہے۔ مع مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن غیر مجلد ۱۰ جلد ہر کھدار۔

(بلا مقدمہ غیر مجلد ہر کھدار مجلد ہے کھدار)

طلی قدیمہ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی آشوری بابل بنی اسرائیل و فنیقیہ کی معاشرت عقاید صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیئے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لیے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ صفحہ ۴۰ قیمت ہر کھدار

سجلی کے کرشمے۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے بھوپن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ اس کے پیریں کے لیے بھی مفید ہے۔ مجلد قیمت ہر کھدار

اُردو

۱۔ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہر جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کر چکیا۔

۲۔ یہ خالص ادبی رسالہ ہر جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہو، حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا۔

۳۔ قیمت لہر سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکان انجمن ترقی اُردو سے ۱۱ روپے

۴۔ تمام خط و کتابت :- آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو واڈیٹر اُردو اور رنگ آباد دکن سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدائی خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انڈی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)

